یاد کیجیے

ہمارے رہنما

(۱)

مترجم: اقبال مہدی زیدی

چلڈرن بک ٹرسٹ   قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان   بچوں کا ادبی ٹرسٹ

Portraits by Sahana Pal

پہلا انگریزی ایڈیشن : 1989

پہلا اُردو ایڈیشن : مارچ 1999

تعداد اشاعت : 3000

قیمت : 35.00 روپے

This Urdu edition is published by the National Council for Promotion of Urdu Language, M/o Human Resource Development, Department of Education, Govt. of India West Block I, R.K. Puram, New Delhi, by special arrangement with Children's Book Trust and Bachchon Ka Adabi Trust, New Delhi and printed at Indraprastha Press (CBT), New Delhi

بنکم چندر

سنکھا موئے بھٹاچارجی

"تجھے سلام   اے ماں!

جو پھلوں سے مالا مال ہے۔

جس کا بہتا پانی

ٹھنڈی ہوا

کیا، شفاف، صاف۔

جس کی فصلیں

بھری پری، ہری ہری۔

اور چاندنی رات

جادو جگائے

جس کی پھلوار

کھلے پھول دمکائے۔

ممتا کی مسکان لیے،

سہانی آواز میں،

ماں!

تو ہمیں بخشا کرتی ہے۔

سکون۔   "

بنکم چندر

گھر کے سامنے، سڑک کے اُس پار، گانوں کی پاٹھ شالہ تھی۔ چھپر پڑی ایک چھوٹی سی کٹیا، جس کے باہر میدان میں، پیڑوں کے نیچے، بچّے بیٹھے زور زور سے اپنا سبق دہرا رہے تھے۔ بنکم چندر خاموش کھڑا اُنھیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پاٹھ شالہ میں نہیں پڑھتا تھا۔ پنڈت جی خود اُس کے گھر آکر اُسے پڑھاتے تھے۔

سڑک پر خوب چہل پہل رہتی۔ گنگا گھاٹ سے پاس کے بازار تک لوگ آتے جاتے رہتے۔ سامان سے لدی بیل گاڑیاں کچّی سڑک پر دھیرے دھیرے رینگتیں۔ کبھی کبھی کوئی پالکی بھی گزر جاتی، پسینے میں شرابور کہاروں کے کندھوں پر لچکتی ڈولتی۔ بچّوں کے لیے یہ رونق پاٹھ شالہ ہی کا ایک حصہ تھی۔

ایک دن، ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور ہاتھ ہلا ہلا کر چلّانے لگا۔ ''گورا صاحب آس چھے''(انگریز آرہے ہیں)۔

پنڈت جی نے فوراً چھٹی کر دی اور بچے ایسے غائب ہوئے جیسے ذرا سا کھٹکا ہونے پر چڑیاں بکھر کے اڑ جاتی ہیں۔ ایک کسان سبزیاں بیچنے بازار جا رہا تھا۔ وہ اپنا ٹوکرا پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا۔ دُکان داروں نے جلدی جلدی دکانیں بند کر دیں۔ ہر آدمی دوڑ کر اپنے گھر میں گھس گیا، اور دروازہ بند کر لیا۔ پورے گانوں میں سنّاٹا چھا گیا۔

بس بنکم چندر کھڑا رہ گیا۔ اُس نے پنڈت جی کی چھڑی اُٹھائی اور سڑک کے بیچ میں کھڑا ہو کر گوروں کا انتظار کرنے لگا۔ اُس کی بہن نندنی دوڑتی ہوئی آئی۔ ''بنکے! چل اَمّا بلا رہی ہیں۔''

"نہیں دیدی۔ اماں سے کہہ دو، آج میں گوروں کو دیکھ لوں گا۔"

دُرگادیوی کھڑکی سے لگی یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ اپنے چھوٹے بیٹے پورن چندر کو اکیلا چھوڑ کر وہ گھر سے باہر جا بھی نہیں سکتی تھی۔ "ارے کوئی بنکے کو اندر پکڑ لاؤ۔" رُہانسی آواز میں وہ چلاّئیں۔ لیکن کون جاتا؟ باہر نکلتے سب ڈر رہے تھے۔ آخر اُن کا بڑا بیٹا سنجیپ چندر بہن کے ساتھ خود بھی، بنکم چندر کو سمجھانے نکلا۔

"کاش اس کے باپ آج یہاں ہوتے" دُرگادیوی نے سوچا۔

جادو چندر چٹوپادھیہ، گھر سے دور کہیں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ سب سے بڑے بیٹے شیام چندر کو وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ بنکم چندر کو قابو میں رکھنے والا اب گھر پر کوئی نہیں تھا۔

کھڑکی میں اپنی ماں کے پاس کھڑے ہوئے پورن چندر نے انگریزوں کو آتے ہوئے سب سے پہلے دیکھا۔ "وہ آگئے۔" وہ چلاّیا۔ سنجیپ چندر اور نندارانی بھاگ کر گھر میں آگئے اور اَدھ کھلے کواڑوں کی اوٹ میں سہمی سہمی نگاہوں سے باہر جھانکنے لگے۔ کچھ انگریز چلے آرہے تھے۔

شمالی ہندوستان سے کلکتے پہنچنے کا سب سے چھوٹا راستہ دریا دریا آنے کا تھا۔ انگریز صاحبوں سے بھری کشتیاں رات بھر گنگا میں چلتیں۔ صبح انھیں کہیں کنارے پر روک کر یہ انگریز کھانے پینے کا سامان اِکٹھا کرنے پاس کے گانوں پر چڑھ دوڑتے۔ بازار میں رکھی چیزیں لوٹ لیتے۔ دکانیں لوٹ کر ان میں آگے لگادیتے۔ اور اگر کوئی انھیں ٹوکتا تو اُسے مار ڈالتے۔ اور پھر اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر آگے بڑھ جاتے۔ گنگا کے کنارے ہونے کی وجہ سے نئی ہاٹی کے کنٹھل پاڑا گانوں کی اکثر اس مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

خوش قسمتی سے گانوں والوں کو آج کچھ پہلے ہی خبر ہوگئی تھی اور انگریزوں کو گانوں میں سارے گھر اور دکانیں بند اور گلیاں خالی ملیں سوائے ایک دس سالہ بچے کے جو ہاتھ میں چھڑی لیے سڑک پر جما کھڑا تھا۔ اُنھوں نے اُس سے چھڑی چھیننے کی کوشش کی۔ بنکم چندر نے چھڑی نہیں چھوڑی۔ اُس کے تیور دیکھ کر انگریزوں نے اُسے چھوڑ دیا۔ گانوں میں بھی نہیں گھسے اور خالی ہاتھ اپنی کشتیوں کی طرف لوٹ گئے۔

انعام

اپنے کمرے سے نکلتے وقت بنکم چندر کو بس یہ ہی فکر تھی کہ کالج پہنچنے میں کہیں اُسے دیر نہ ہو جائے۔ وہ بھول ہی گیا تھا کہ آج اُس کی سولہویں سالگرہ ہے۔ جیسے ہی وہ اوپر سے اُتر کر رسوئی میں داخل ہوا، درگا دیوی بولیں۔

''آؤ بنکے...... بیٹھو......'' آج اُنھوں نے اُس کے لیے بڑھیا ناشتہ تیار کیا تھا۔

''اتنا بہت سا کھانا!''

''اپنی سالگرہ کا دن تم بھول سکتے ہو، لیکن میں کیسے بھول سکتی ہوں؟''

اُنھوں نے پیار سے کہا۔ ''لو اب ذرا اطمینان سے آہستہ آہستہ کھاؤ۔''

بنکم چندر نے جلدی جلدی کھانا نگلا۔ ''پہلا گھنٹہ لٹریچر کا ہے۔ آج ضرور دیر ہو جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھا، ماں کے پاؤں چھوئے، کتابوں کا تھیلا اُٹھایا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

دروازہ میں کھڑی دُرگا دیوی، پیار بھری نظروں سے بنکم چندر کو دیکھتی رہیں جو رادھا بلبھ کے مندر کے سامنے سے اُس چوڑی نہر کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا جو مڑ اتی مڑ اتی جا کر گنگا میں مل جاتی ہے۔

26/جون 1938، گرمیوں کی ایسی شام تھی جس میں آدمی خود بخود اونگھنے لگتا ہے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ صاف آسمان میں تارے دکنے لگے تھے۔ چاندمیں روشنی آگئی تھی، لیکن گھر میں کچھ ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی جیسے کوئی مہمان آنے ہی والا ہو۔

نو بج کر سات منٹ پر ایک دم سے سنکھ پھونکے جانے کی مبارک آوازیں گھر میں گونج اُٹھیں۔ برآمدوں میں دوڑتے لوگوں کے قدموں کی آواز آنے لگی جو دوسروں کو یہ خبر سنا رہے تھے کہ ''لڑکا پیدا ہوا ہے''۔

''سولہ سال بیت گئے لیکن مجھے ہر بات ایسی یاد ہے گویا کل ہی یہ سب ہوا ہو۔ وقت کتنی

جلدی گزر جاتا ہے۔" دُرگادیوی نے لمبی سانس لی اور دروازے سے مڑ کر اندر چلی گئیں۔

"میرے اپنے باغیچے کے لیے۔"

اُس نے بڑے پیار سے پیلی چمیلی کے اُس ننھے سے پودے کو چھوا جو مالی نے اُسے پیش کیا تھا۔ کیلے کی ایک نازک سی پتّی میں لپٹا وہ پودا اب اُس کی کتابوں کے پاس رکھا ہوا تھا۔ بنکم چندر کو آج گھر جانے کی جلدی تھی۔ ہگلی کالج کے پیتل کے بڑے سے گھنٹے کی آواز نے آخر چھٹی کا اعلان کر ہی دیا۔ وہ تیزی سے اپنی کلاس کے نکل کر گنگا گھاٹ کی طرف لپکا اور اپنی ڈنگی (چھوٹی ناؤ) میں جا بیٹھا۔ جسے ملّاح نے دوسرے کنارے کی طرف کھینا شروع کر دیا۔ کالج آنے جانے کا یہ سب سے چھوٹا راستہ تھا۔ ایک گھنٹہ روز، ناؤ سے۔

کتابوں کے تھیلے پر سر رکھ کر وہ ناؤ کے تختوں پر سیدھا لیٹ گیا، آسمان کر طرف۔ منہ کر کے۔ "کتنا بڑا! کیسا کھلا ہوا! آزاد!" وہ سوچنے لگا۔

اوپر آسمان میں ایک باز، اکیلا چکّر لگا رہا تھا۔ "کاش یہ پرندہ میں ہوتا"۔ اُس کا جی چاہا۔

نرم لہریں ڈنگی کے پہلو سے ٹکراتیں اور سینکڑوں چمکدار موتی بکھر جاتے، جنھیں سمیٹ کر نئی لہر پھر بکھیر دیتی۔ اُفق (آسمان کا زمین سے ملتا کنارا) میں ڈوبتے سورج کی سُرخی سے جھلملاتی لہریں چُپ چاپ ناؤ کے آگے آگے جاتی معلوم ہوتیں۔ آگے کی طرف یہ سَفر کیوں؟ کیا کرتا ہے آدمی اپنی زندگی میں؟ مجھے اپنی زندگی میں کیا کرنا ہوگا؟ اپنے ان ہی خیالوں میں وہ کھویا رہا۔

کشتی کنارے سے لگی اور دھکّا لگتے ہی ملّاح پکارا۔ "بابو! سنبھل کے" بنکم چندر اُٹھ بیٹھا۔ وہ دوسرے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔

کالج سے آکر بنکم چندر سنسکرت پڑھنے سری رام نیائے باگش کے گھر چلا گیا۔ میجو ٹھاکر دا (دادا کے منجھلے بھائی) شطرنج کے مہرے سجائے اُس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ دونوں کو یہ کھیل بہت پسند تھا۔ لیکن آج بنکم چندر کا جی شطرنج کھیلنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

"مجھے آپ کہانی سنائیے"۔ اُس نے منجھلے دادا سے کہا۔

"لیکن سب کہانیاں تو تم سُن چکے ہو۔"

"دادا...... میں اُنھیں پھر سننا چاہتا ہوں۔"

"اچھا۔ تو کون سی سناؤں!"

"وہی۔ ستیاسی انقلاب والی۔"

میجو ٹھاکر دا کہانیاں بہت مزے سے سناتے تھے۔ بنکم چندر جب سنتا تو اُسے کسی چیز کی خبر نہ رہتی۔ وہ کہانی سُن ہی رہا تھا کہ جادو چندر نے اُسے پکارا۔

"بنکا!"۔ سمبد پربھاکر' نام کے رسالے کی ایک کاپی اُن کے ہاتھ میں تھی۔

"کیا نظموں کے مقابلے میں حصّہ لیا تھا تم نے!"

"جی بابا۔"

"نتیجہ آگیا ہے۔" اُنھوں نے رسالہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "تمھیں پہلا انعام ملا ہے۔"

"سچ۔" میجو ٹھاکر دا نے کہا۔ "مجھے وہ نظم سناؤ۔"

بنکم چندر بولتے اچھا تھے۔ خوش خوش وہ کھڑے ہوئے اور کھنکار کر اپنا گلا صاف کرنے لگے۔ بیٹے کی لیاقت کو دیکھتے ہوئے جادو چندر نے اُنھیں پریزیڈنسی کالج میں قانون پڑھنے کلکتے بھیجنے کی فیصلہ کر لیا۔

جولائی 1856 میں بنکم چندر کلکتے پہنچے۔ بنیشور نام کا ایک رسوئیا اور ایک ذاتی ملازم مُرلی اُن کے ساتھ بھیجے گئے۔

توہین

پریزنڈسی کالج۔

اونچے اونچے کورنیتھائی وضع کے کھمبے، آدمی پر رُعب ڈالنے والے، لمبے چوڑے

برآمدے۔ سیڑھیوں کے سلسلے جن پر گئے زمانوں میں بڑے بڑے لوگ اُترا چڑھا کرتے تھے۔

کلاسیں شروع ہونے ہی والی تھیں۔ نچلے نہ بیٹھ سکنے والے طالب علموں کی بھن بھن سے کمرہ بھرا ہوا تھا۔ بنکم چندر آکر اگلی بینچ میں اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

کیشب چندر سین نے ستیندر ناتھ ٹیگور کے کان میں کہا۔ ''لو! وہ بنکم آ گئے''

فوراً اُٹھتے ہوئے ستیندر بولا۔ ''لِلتا او مانس پر بات کرنے کے لیے میں کتنا بے تاب ہوں۔

اُسی وقت مسٹر سٹ کلف جو پرنسپل تھے ایک اہم اعلان کرنے آ گئے۔

''حال ہی میں بنی کلکتہ یونی ورسٹی نے اعلان کیا ہے کہ اُس کے پہلی بار ہونے والے بی۔ اے۔ کے امتحان میں جو طالب علم بیٹھنا چاہتے ہیں وہ پہلے داخلے کے امتحان میں شریک ہوں، جس کے لیے فارم کالج کے دفتر سے ملیں گے۔''

زیادہ تر طالب علم اس امتحان میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ ہر طرف اُسی کے بارے میں بات چیت ہونے لگی۔ اور اندازے لگائے جانے لگے کہ یونی ورسٹی کا پہلا گریجویٹ کون ہوگا۔؟ ستیندر ناتھ کو بنکم چندر سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ آخری کلاس ختم ہوتے ہی بنکم چندر کمرے سے نکل گئے۔

''جلدی''۔ ستیندر ناتھ نے کہا اور لکڑی کی بینچوں میں سے احتیاط کے ساتھ گزرتے ہوئے وہ بنکم چندر کے پیچھے بھاگا۔ کیشب چندر نے بھی جلدی جلدی اپنی کتابیں سمیٹیں اور وہ بھی تیزی سے پیچھے لپکا۔ باغ کی طرف نیچے اُترتی سیڑھیوں پر اُنھوں نے بنکم چندر کو جا پکڑا۔

''بنکم! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم شاعر ہو۔ میں نے ایک کتاب ''للتا او مانس'' پڑھی۔ اُس میں دو لمبی نظمیں ہیں۔ کیا وہ تم نے لکھی ہیں؟''

''جی ہاں''۔ اُس کی یہ پہلی کتاب ابھی چھپی تھی۔

''دیکھا کیشب''۔ ستیندر ناتھ ذرا اونچی آواز میں بولا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا، یہ ضرور ہمارے بنکم نے لکھی ہوگی۔''

لیکن کیشب کو اگلی اتوار کی سیر کے پروگرام میں زیادہ دل چسپی تھی۔ بنکم چندر کو ساتھ چلنے کے لیے راضی کرنا اُسی کی ذمہ داری تھی۔ ہر شخص سوچتا تھا کہ وہ نہیں جائیں گے۔ اکہرا بدن، کھلتا ہوا رنگ، خاموش، باوقار، ذہین آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ کے پیچھے اپنے جذبات کو چھپائے بنکم چندر دوسروں سے کچھ مختلف، الگ تھلگ رہنے والے لگتے تھے۔

باتیں کرتے کرتے وہ کالج کے دروازے پر پہنچ گئے تھے کہ کیشب چندر نے کہا ''بنکم! اس اتوار کو ہم نے سیر کا ایک پروگرام بنایا ہے۔ مجھے امید ہے تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔''

''تمہیں ضرور ہمارے ساتھ چلنا چاہیے۔'' ستیندر ناتھ نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''پروفیسر مترا بھی ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔''

''کہاں؟''

''بوٹینکل گارڈن''۔

''ٹھیک ہے۔ میں چلوں گا۔'' بنکم چندر نے کہا۔

''دیکھا!'' ستیندر ناتھ پھر ایک دم زور سے بول اُٹھا۔

سامنے کے فٹ پاتھ پر درمیانہ قد کا ایک شخص پالکی سے اُترا۔ سادہ لباس میں دھوتی باندھے اور چادر لپیٹے۔

''یہ کون ہیں؟'' بنکم چندر نے پوچھا۔

''پنڈت اشور چندر ودیا ساگر'' کیشب چندر نے بتایا۔ ''اور اُن کے ساتھ جو دوسرے صاحب ہیں وہ ہیں دبیندر ناتھ ٹیگور۔ ہمارے دوست ستیندر ناتھ کے والد جو آج کل برہمو سماج کے آچاریہ ہیں''

یہ دونوں بزرگ سنسکرت کالج کی طرف بڑھے تو سڑک پر چلتے لوگ رُک کر انھیں دیکھنے لگے۔

"یہ لوگ بیواؤں کی شادی کے بارے میں ایک جلسے میں شریک ہونے آئے ہیں۔" ستیندر ناتھ نے بتایا۔ بنکم چندر حیرت سے ان بڑے لوگوں کو دیکھتے رہے جن کے بارے میں اُنھوں نے کتنا کچھ سنا تھا اور پڑھا تھا۔

☆ ☆ ☆

بوٹینکل گارڈن اُس وقت بہار پر تھا۔ ہر طرف کھلے ہوئے رنگین پھولوں کو دیکھ کر بنکم چندر کو اپنا گھر اور اپنا باغیچہ یاد آگیا۔ کیشب چندر نے کہا "آگے ایک 'پیڑ گھر' ہے"۔

پروفیسر رام چندر مترا نے مذاق کرتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ "آؤ لڑکو۔ 'پیڑ گھر' پر قبضہ جمائیں۔" 'پیڑ گھر' وہ جگہ تھی جہاں سے پورا باغ نظر آجاتا تھا۔ بنکم چندر اپنے پروفیسر کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے چلے جارہے تھے تاکہ دوسروں سے پہلے چوٹی پر جا پہنچیں۔ وہاں ایک انگریز پہلے سے موجود تھا۔ اُس نے جب اتنے سارے دیسی لوگوں کو 'پیڑ گھر' میں داخل ہوتے دیکھا تو غصّے سے چیخا۔ "اے۔ کون ہو تم"

"پرو...... پرو...... پروفیسر رام چندر مترا۔ پرے...... پریزیڈنسی کا...... کالج......" جواب دینے میں ہکلاہٹ پیدا ہو گئی۔

"ایسی تیسی تمہارے پروفیسر کی۔ چلو، بھاگو یہاں سے۔ دور ہو۔"

پروفیسر مترا جلدی سے لڑکوں کو اُس بد تمیز انگریز کے سامنے سے ہٹالے گئے۔ دور جاکر اُنھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لڑکوں کو تسلّی دیتے ہوئے وہ کہنے لگے۔ "چلو ہٹاؤ، چھوڑو، عیسائیوں کی معاف کر دینے کی تعلیم کو ہم اپنائیں اور بھول جائیں۔"

لیکن بنکم چندر اس توہین پر تلملا گئے۔ اس حادثے کی تلخی کو وہ عمر بھر نہ بھلا سکے۔

لعنت

اُٹھارہ سو ستاون۔

اس ڈر سے کہ کہیں باغی کلکتے نہ پہنچ جائیں زیادہ تر انگریز انگلستان واپس جانے کی تاریاں کر رہے تھے۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ لوگ کسی مجبوری میں ہی باہر نکلتے تھے۔

بنکم چندر کالج کے نزدیک ہی کرایے کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ وہ اخبار پڑھ رہے تھے کہ مرلی نے سنجیب چندر کے آنے کی اطلاع دی۔ ''میجویالو' آس چھن۔''

''سب ٹھیک تو ہے؟''بنکم چندر نے پوچھا۔ زمانہ بہر حال خراب تھا۔ اور بیرک پور سے، جہاں منگل پانڈے نے بغاوت کا شوشہ چھوڑا تھا، نئی ہاٹی آنے میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ لگ سکتا تھا۔

''مجھے تمہاری فکر زیادہ تھی۔'' سنجیب چندر نے کہا۔ ''لیکن تم مجھ سے زیادہ مزے میں لگتے ہو!'' اُنھوں نے ایک تکیہ اُٹھایا اور آرام سے پلنگ پر لیٹتے۔ ہوئے پوچھا۔ ''اخبار کیا لکھتا ہے؟ کوئی تازہ خبر!''

''باغی سپاہیوں کو دہلی سے نکال دیا گیا ہے۔''

''بنکا! انقلاب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرا جی چاہتا ہے کہ ہم زیادہ متحد ہوتے۔ ہمارا 'ماضی' شاندار تھا۔ ہمارے 'حال' پر دھند لکا چھایا ہوا ہے۔ اور اتحاد کے بغیر ہمارا 'مستقبل' 'تاریک' ہے۔''بنکم چندر نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

''کاش ہمارے پاس 'رانی جھانسی' جیسے اور بھی رہنما ہوتے۔ اُس کی جرأت کی میں داد دیتا ہوں۔''

انقلاب کے کچلے جانے پر 'ملکہ کا اعلان' جاری ہوا۔ انگریزوں نے سمجھ لیا کہ ملک پر قبضہ جمائے رکھنے کے لیے اُنھیں کسانوں سے رشتہ جوڑنا ہوگا۔ وہ اکثریت میں ہیں۔ اور یہ

مقصد حاصل کرنے کے لیے انگریزوں کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہوگی جن کی تعلیم اور خیالات انگریزوں جیسے ہوں لیکن رنگ اور نسل سے ہندوستانی ہوں۔ ایسے لوگ انگریزوں اور دیسی رعایا کے درمیان رابطہ قائم کرا سکیں گے۔ اسی غرض سے انتظامی عہدوں پر نئے لوگوں کی بھرتی شروع کی جانے لگی۔

اس عرصے میں کلکتہ یونی ورسٹی کے پہلی بار ہونے والے بی۔ اے۔ کے امتحان کا نتیجہ نکل آیا۔ داخلے کے امتحان میں تقریباً چالیس لوگ کامیاب ہوئے تھے۔ 'سلبس' سخت تھا۔ اور جب اصل امتحان کی تاریخوں کا اعلان ہوا تو صرف تین مہینے کا عرصہ تیاری کے لیے اتنا کم تھا کہ زیادہ تر امیدوار امتحان میں بیٹھے ہی نہیں۔ صرف دس بیٹھے۔ ''دس بخشے ہوئے لوگ'' بنکم چندر کہا کرتے تھے۔

''سنا ہے سنسکرت کی کاپیاں وِدّیا ساگر جانچیں گی۔'' وہ کہتے ''دیکھیے کیا ہوتا ہے۔''

سنجیب چندر نے بہت سمجھایا تھا کہ اس مرتبہ امتحان میں مت بیٹھو۔ تیاری کے لیے وقت بہت کم ہے۔ لیکن بنکم چندر نے ایک نہ سنی۔ اب گھبرائے پھر رہے ہیں کہ دیکھیے نتیجہ کیا رہتا ہے۔

جب نتیجہ نکلا تو صرف دو پاس ہوئے۔ بنکم چندر کے نمبر دوسرے سے زیادہ تھے۔ فوراً ہی وائسرائے کے سکریٹری کا خط اُنھیں ملا کہ آکر ملیں۔ جب ملے تو انتظامی عہدوں میں ڈپٹی مجسٹریٹ کا عہدہ اُنھیں پیش کیا گیا۔

وہ راضی تو نہیں تھے۔ لیکن والد کے اصرار پر اُنھوں نے سرکاری ملازمت منظور کر لی اور ساری زندگی اُسے اپنے لیے ایک 'لعنت' سمجھتے رہے۔

جسے میں ٹھیک سمجھتا ہوں

اُن کے استقبال کے لیے بہت لوگ جمع تھے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ ایک کم عمر

نوجوان ڈپٹی مجسٹریٹ بن کر آیا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک کھلی گاڑی میں آئے تھے۔ دو مہینے پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے اپنی بیوی کو اپنے ساتھ 'کھلنا' لے چلنے کا فیصلہ کیا جہاں اُن کا پہلا تقرر ہوا تھا۔ بنکم چندر نے بیوی کا ہاتھ تھام کر اُنھیں گاڑی سے اُتارا۔ راج لکشمی دیوی نے ساری کے کنارے کو سر پر اور کس لیا۔ نئی جگہ سے وہ ذرا گھبرائی ہوئی تھیں۔ اُن کی سہیلیوں کو جب معلوم ہوا کہ وہ 'کھلنا' جارہی ہیں تو "نیل کر (نیل کا ٹیکس وصول کرنے والے) انگریزوں" سے ہوشیار رہنے کو بار بار کہا تھا۔

نیل کر انگریز!

نیل کے بارے میں جو قانون بنا تھا اُس میں لکھا تھا کہ ہر کسان کو ٹیکس (کر) ادا کرنے کے لیے اپنی زمین کے ایک حصّے میں نیل بونا ہوگا۔ اس 'کر' کو وصول کرنے کی ذمہ داری نیل کا کاروبار کرنے والے انگریزوں کے سپرد تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ 'کر' وصول کرنے والے یہ انگریز کسانوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ اپنی زمین کے بڑے حصّے پر، بلکہ پوری زمین پر اناج کے بجائے نیل بوئیں۔ نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ اناج کم پیدا ہوتا اور لوگ بھوکے مرتے۔ لیکن نیل کی پیداوار بڑھتی اور نیل کا کاروبار کرنے والے انگریزوں کو زیادہ نفع ملتا۔ باہر کے ملکوں میں نیل مہنگا بکتا تھا کیوں کہ وہ رنگ وغیرہ تیار کرنے میں کام آتا تھا۔

موریل نام کا ایک نیل کر انگریز تھا۔ وہ گھوڑے، بندوقوں اور تین سو پہلوانوں کی ایک فوج اپنے ساتھ رکھتا اور ایک ڈکٹیٹر کی طرح راج کرتا تھا۔ لوگوں کو لوٹتا، مارڈالتا اور گانوں کا گانوں پھونک دیتا۔ کوئی اس کو روکنے والا نہیں تھا۔ اُس کے ہنٹر کے نیچے جتنا علاقہ آتا تھا اُسے وہ مدریل گنج کہتا تھا۔ پولیس کو وہ رشوت کھلاتا تھا تاکہ اُس کی کارستانیوں پر پردہ پڑا رہے۔

نئے ڈپٹی مجسٹریٹ کو اُس نے دور ہی سے دیکھا تھا۔ بیس سال کا ایک خوبصورت نوجوان۔ دل ہی دل میں وہ ہنسا۔ یہ تو بلّی کے ہاتھ ایک کبوتر لگ گیا۔

بَرکھالی نام کا ایک گانوں تھا۔ اکیلا گانوں جو موریل کا حکم مان کر نہیں دیتا تھا۔ اپنے لیڈر رحیم اللہ کی سرکردگی میں سارے گانوں والے اکٹھے ہو کر لڑتے تھے۔ ایک رات، موریل

نے اپنے لوگوں کو اس گانوں پر حملہ کرڈالنے کا حکم دیا۔ اُنھوں نے گانوں کو لوٹا اور جلادیا۔ رحیم اللہ کو جان سے مار ڈالا اور اُس کی لاش بھی اُٹھالے گئے۔ یہ سب کچھ موریل کے دو دوستوں لائٹ فوٹ اور ہلنے کی نگرانی میں ہوا۔

بنکم چندر کو جب اس واردات کی اطلاع ملی تو اُنھوں نے فوراً وارنٹ جاری کر دیے۔ موریل نے پہلے اُنھیں رشوت دینی چاہی۔ جب اُس میں ناکام رہا تو دھونس دی۔

"جس کام کو میں ٹھیک سمجھتا ہوں اُس کو انجام دینے سے مجھے کوئی چیز نہیں روک سکتی، (نہ لالچ نہ خوف)۔" اُنھوں نے کہلوادیا۔ اور اِن انگریزوں کو گرفتار کرنے، وہ پولیس لے کر نکلے۔ ہر جگہ اُن کا پیچھا کرتے رہے۔ عاجز آکر موریل اور لائٹ فوٹ ایک چھوٹی کشتی میں سوار ہو کر سمندر میں نکل گئے۔ اُن کے کنارے پر کہیں پہنچ جانے کی بھی خبر نہیں ملی۔ ہلنے ایک فقیر کے بھیس میں بمبئی پہنچا۔ انگلستان جانے کے لیے وہ ایک جہاز پر سوار ہو ہی رہا تھا کہ گرفتار کرلیا گیا۔

انگریزوں کا ڈر اتنا تھا کہ کوئی گواہی تک دینے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ آخر بنکم چندر نے مقدمہ ایک دوسرے جج کے سپرد کیا اور خود گواہ بن کر پیش ہوئے۔

"نیل کر" گوروں کا ظلم اگرچہ دوسری جگہوں پر بعد میں بھی جاری رہا لیکن بنکم چندر کے علاقے میں پھر امن رہا۔

ایک ناول

"تمھیں اب سو جانا چاہیے"۔ راج لکشمی دیوی نے کہا۔ "دن بھر دفتر سے تھک کر آئے ہو، اور اب رات بھی کافی ہو چکی ہے۔"

میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی اُن کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور باقی کمرے میں پھیلے اندھیرے میں اُن کی کھڑی ناک اور جمی ٹھوڑی صاف نظر آرہی تھی۔ وہ کچھ دیر اور لکھتے

رہے پھر اپنا قلم رکھتے ہوئے بولے "ختم" اور ایک لمبا سانس لیا۔

"کیا ہے یہ؟"

"ناول ہے، انگریزی میں۔"

"ناول! کیا نام ہے اس کا؟"

"سوچتا ہوں، اس کا نام رکھوں 'راج موہن کی بیوی'۔"

"میرا جی چاہتا ہے تم اسے بنگالی میں لکھتے۔"

"کیوں؟"

"تب میں بھی اس کو سمجھ پاتی۔"

"عالم لوگ کہتے ہیں کہ اَدَب صرف سنسکرت میں لکھا جاسکتا ہے۔ اپنے دماغ میں آئی ہوئی کوئی نئی انوکھی بات ہندوستان کی کسی اور زبان میں، پورے طور پر اور اچھے ڈھنگ سے ادا نہیں کی جاسکتی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ بنگالی، ہندی، تلیگو یا ہندوستان کی کسی اور زبان میں کبھی کوئی ناول نہیں لکھا گیا۔"

"تو پھر ہماری یہ زبان آخر ہے کس کام کی؟"

"اَن پڑھ لوگوں کے آپس میں بات چیت کرنے کے لیے۔"

راج لکشمی دیوی مسکرائیں۔ "تم تو پڑھے لکھے ہو، لیکن بات چیت بنگالی میں کرتے ہو۔ ہماری ہندوستانی زبانوں کے بارے میں دوسرے لوگ جو کچھ کہتے ہیں کیا تم بھی انھیں سچ سمجھتے ہوں؟"

"پتہ نہیں"۔ بنکم چندر کو آخر مان لینا پڑا۔

راج لکشمی دیوی نے میز پر کھانا لگادیا۔ وہ کھانا خود ہی پکانا پسند کرتی تھیں۔ آج اُنھوں نے 'کٹی' مچھلی پکائی تھی جو بنکم چندر کو بہت پسند تھی۔ وہ خود پام کے پتے کا پنکھا ہاتھ میں لے کر

پاس کھڑی ہو گئیں۔

بنکم چندر نے کانٹا اور چمچہ اُٹھایا۔ انتظامیہ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد وہ صاحب لوگوں کی طرح کوٹ پتلون پہنتے۔ کھانا میز پر کانٹے چمچے سے کھاتے۔ دراصل سارے سرکاری اَفسر یہ ہی کیا کرتے تھے۔ کچھ دیر تک وہ کھانا تو تکتے رہے۔ پھر گلاس اُٹھا کر سارا پانی پی گئے۔

''آج تم اتنے بے چین سے کیوں نظر آتے ہو؟'' راج لکشمی دیوی نے پوچھا۔ ''نیل کر صاحبوں' کے ساتھ کوئی نیا معاملہ پیش آیا۔؟''

''نہیں۔'' بنکم چندر نے کہا۔ ''پتہ نہیں کیوں، لیکن میں اپنے ناول سے مطمئن نہیں ہوں۔''

''چھوڑو ناول کو۔ آرام سے کھانا کھاؤ۔؟''

'کٹی' مچھلی اگر چہ بہت لذیذ ہوتی ہے مگر اُس میں چھوٹے چھوٹے کانٹے بہت ہوتے ہیں۔ بنکم چندر نے اُسے کانٹے چمچے سے کھانے کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار پلیٹ میں پھسل کر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہو جاتی۔ تھک ہار کر انھوں نے کوشش چھوڑ دی۔

راج لکشمی اُنگلیوں سے کھانا کھایا کرتی تھیں۔ بنکم چندر کی یہ کوشش اُنھیں مضحکہ خیز لگی اور وہ اپنی ہنسی نہ روک سکیں۔ ''جو کام تم آسانی سے کر سکتے ہو اُس کے لیے جوکھم کیوں اُٹھاتے ہو؟''

''ٹھیک کہتی ہو۔ بالکل ٹھیک۔'' بنکم چندر مُسکرائے اور انگلیوں سے کھانا شروع کر دیا۔

نئی ڈگر

دیر رات گئے بنکم چندر میز پر آکر بیٹھ گئے۔ اُن کی بے چینی جاتی رہی تھی۔ دھیمی مسکراہٹ اُن کے چہرے کو روشن کیے تھی۔ کاغذ کے سفید تختوں کو وہ سلیقے سے رکھ رہے تھے پہلے صفحے پر اُنھوں نے لکھا۔

دُرگیش نندنی
(بنگالی میں ایک ناول)

اُن کے بچپن میں میجو ٹھاکر دانے اُنھیں یہ کہانی سنائی تھی۔ بنکم چندر نے اُس کہانی کو ناول کا روپ دینے کی ٹھانی۔

اُس کے بعد کا ہفتہ راج لکشمی دیوی کے لیے نئی نئی حیرانیاں لایا۔ بنکم چندر نے انگریزی لباس پہننا چھوڑ دیا اور ڈھیلا ڈھالا چوغہ (چپکن چوغہ) پہن کر دفتر جانے لگے۔ اور اب وہ اُنگلیوں سے کھانا کھانے لگے۔

ایک مرتبہ رات کے کھانے پر راج لکشمی اپنے تجسّس (پتہ لگانے کی خواہش) کو نہ روک سکیں اور پوچھ بیٹھیں "تمھیں ہوا کیا ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" بنکم چندر نے جواب دیا۔ "جو کام آسانی سے کر سکتا ہوں اُس کے لیے جوکھم کیوں اٹھاؤں؟"

"یہ بات ہے"۔ راج لکشمی نے سب کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔ اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

'دُرگیش نندنی' ناول ابھی آدھا ہی لکھا گیا تھا کہ اُن کے تبادلے کا حکم آ گیا۔ اب اُن کا تقرر جنوبی بنگال میں 'بروئی پور' کا ہوا۔ یہاں کے زیادہ پُر سکون ماحول میں بنکم چندر نے اپنا ناول مکمل کر لیا۔

ایک دن اُنھوں نے اپنی بیوی سے کہا، "اب مجھے اس کے بارے میں لوگوں کی رائے معلوم کرنی ہے۔ اس کام کے لیے سب سے اچھے گرولیا کے پنڈت رہیں گے۔ میں اُن کی رائے لوں گا۔"

راج لکشمی دیوی نے اُن سے اتفاق کیا۔ بنکم چندر نے اُن پنڈتوں کو 'نئی ہاٹی' میں اپنے گھر بُلایا۔ اُن کے بھائی اور کچھ دوست بھی موجود تھے۔ اِن قابل لوگوں کو اُنھوں نے اپنا ناول پڑھ کر سنایا۔

دو دِن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ناول پڑھتے وقت مکمل خاموشی چھائی رہتی۔ لگتا سننے والوں پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ جو سنائی جا رہی تھی وہ اُن کی اپنی ہی زبان تھی۔ لیکن کتنی میٹھی! جیسے یہ وہ زبان نہ ہو جسے وہ ہر وقت بولا کرتے تھے۔ یہ ان کی اپنی ہی زبان تھی جس میں ایسے خیالات کا اظہار کیا جا رہا تھا جیسا پہلے کبھی نہیں کیا گیا تھا۔ ایسا اَدب تخلیق کیا جا رہا تھا جو اب تک نہیں سنا گیا تھا۔ یہ تو ایک خواب سا تھا۔

بغیر تراشا ہوا ایک ہیرا جسے وہ پتھر کے ڈلے کے طور پر استعمال کرتے رہے تھے، ایک ماہر فنکار نے اُسے ایسا تراشا ایسا صاف کیا کہ وہ جگمگ کر اُٹھا۔

ناوِل 'دُرگیش نندنی' 1865 میں شایع ہوا۔ اور پورے ملک میں دھوم مچ گئی۔ وہ ایک تاریخی ناول تھا جس میں کالج کے دنوں میں بنکم چندر کے اس خیال کی گونج تھی کہ ہمارا ماضی شاندار ہے۔

ملک کی تاریخ کے اس شعور نے اس دھرتی سے تعلق رکھنے پر ایک فخر سا پیدا کر دیا۔

دو اور ناوِل ایک کے بعد ایک شائع ہوئے۔ 'کپال کنڈل' اور 'مہرنالنی'۔ پہلے والے کو دنیا کے بڑے ناولوں میں شمار کیا گیا اور بنکم چندر پورے ملک میں مشہور ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

بڑی جرأت

لیکن بروئی پور میں سکھ چین کی زندگی تھوڑے دن کی تھی۔

سردیوں کی شام چھوٹی ہوتی ہے۔ سورج غروب ہو گیا تھا لیکن اُس کی کرنیں ابھی آسمان کو روشن کیے تھیں۔ پورن چندر ملنے آئے ہوئے تھے اور سارے گھر والے ہنسی خوشی چائے کی میز کے گرد جمع تھے۔ اچانک مُرلی گھبرایا ہوا گھر میں آیا۔

"زمیندار کے لٹھیتوں "لٹھ چلانے والے) نے آکر گھر گھیر لیا ہے۔ کچھ کے پاس بندوقیں بھی ہیں۔ وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔"

بنکم چندر فوراً کھڑے ہو گئے۔

"دادا (بڑے بھائی) وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"میں اُنھیں سنبھال لوں گا۔"

بنکم چندر باہر نکل آئے۔ پورن چندر اُن کے ساتھ تھے۔

"تم لوگ کیا چاہتے ہو۔؟" بنکم چندر نے اُن سے پوچھا۔

ایک شخص نے جو اُن کا لیڈر لگتا تھا، بنکم چندر کی طرف بندوق تان کر کہا۔ "زمیندار کے مقدمے کا فیصلہ تمھیں بدلنا ہوگا۔ اگر تم نہیں بدلو گے تو میں تمہارے سب گھر والوں کو مار ڈالوں گا۔"

اُس دن عدالت میں بنکم چندر نے ایک زمیندار کو سزا سنائی تھی، غریب کسانوں کو مار پیٹ کر اُن سے زبردستی روپیہ وصول کرنے کے جُرم میں۔ اب صورتِ حال بہت خطرناک تھی۔

"کوئی جج اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔" بنکم چندر نے نہایت سکون کے ساتھ جواب دیا۔

تقریباً سو لٹھیتوں نے غُل غپاڑا مچانا شروع کر دیا۔

"لیکن" بنکم چندر نے کہا "جو سزا سنائی گئی ہے اُس سے بچنے کی میں کوئی صورت نکال سکتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے کاغذات کو پھر پڑھنا پڑے گا۔ اس کے لیے آپ مجھے آدھے گھنٹے کا وقت دیجیے .... مُرلی"۔ اُنھوں نے پکارا "مہمانوں کا چائے اور تمبا کو لا کر دو۔"

"اب تم کیا کرو گے؟" راج لکشمی بہت پریشان تھیں۔

"دیکھتی جاؤ۔"

جلدی سے اُنھوں نے ایک نوکر سے اُس کے کپڑے لے کر پہنے اور پورن چندر کو بھی پہنوائے۔ شام کے جھٹپٹے میں لٹھیتوں نے دو نوکروں کو گھر سے نکلتے دیکھا۔ وہ دھوتی باندھے

تھے، ہوا ٹھنڈی تھی۔ دونوں سکوڑے جا رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بازار سے سودا سلف لانے کا تھیلا تھا۔ دوسرا سرسوں کے تیل کی بوتل اُٹھائے تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے اُس نے سر پر تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔

ایک لٹھیت نے بڑی بدتمیزی سے پوچھا، "ارے تمہارے بابو نے کام ختم کیا یا نہیں؟"

"ابھی نہیں۔"

"ابھی وہ پڑھنے میں لگے ہوئے ہیں۔"

اتنی دور جاکر کہ لٹھیت نہ اُنھیں دیکھ سکیں، بنکم چندر بوتل پھینک سیدھے تھانے بھاگے۔ ڈپٹی مجسٹریٹ کو اِن کپڑوں میں دیکھ کر تھانیدار حیران رہ گیا۔ بنکم چندر نے اُسے حالات بتائے۔

پولیس کا حملہ اتنا اچانک ہوا کہ لٹھیتوں کو اپنی لاٹھی اُٹھانے کا بھی مہلت نہ ملی۔ وہ سب کے سب پکڑ لیے گئے۔ جس زمیندار نے اُنھیں بھیجا تھا اُس پر جرمانہ ہوا۔

لیکن انگریز اس کارروائی سے ناخوش ہوئے کیوں کہ بروئی پور کا زمیندار اُن کا وفادار تھا۔ بنکم چندر کی بڑھتی ہوئی ہر دل عزیزی اُنھیں کھٹکنے لگی تھی۔ بنکم چندر جو بھی کرتے لوگ اُس پر دھیان دیتے۔ انگریزوں اور اُن کے چہیتے زمینداروں کے خلاف بنکم چندر کے قانونی فیصلوں کا لوگوں میں بہت چرچا رہتا۔

جہاں وہ جاتے لوگ اُن سے محبت سے پیش آتے۔ اُن کی جرأت اور انصاف پسندی کی سب قدر کرتے۔ 'بنگا درشن' رسالے میں اُن کے اگلے ناول 'بش برکھو' کی قسط وار اِشاعت سے لوگ اُنھیں "اپنا" آدمی سمجھنے لگے۔

انگریزوں نے بنکم چندر کا جلدی جلدی تبادلہ کرتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ اس سے وہ پریشان ہو جائیں گے اور حق پرستی کے اپنے جذبات کو دبا کر رکھنے لگیں گے۔

لیکن بنکم چندر ہار ماننے والے نہ تھے۔ وہ زیادہ محنت سے کام کرنے لگے۔ دیر رات تک

لکھا کرتے۔ اُن کی صحت خراب ہو گئی لیکن اُنھوں نے ہار نہیں مانی۔

☆ ☆ ☆

'ہٹو .... ہٹو .... ہٹو! .... ہٹو .... ہٹو ....'

فوجی افسروں نے آگے بڑھتی ہوئی پالکی کو روک لیا۔ اُن کے کمانڈنگ آفیسر کرنل ڈفّن نے بند دروازوں پر اتنی زور زور سے ہاتھ مارے کہ پوری پالکی ہلنے لگی۔

بنکم چندر کود کر باہر آئے۔ "کون ہو تم؟" اُنھوں نے پوچھا۔

کرنل ڈفّن نے جواب دینے کے بجائے اُن کے کندھے پکڑ کر اُن کا رُخ موڑ دیا اور سڑک سے پرے دھکیل دیا۔ بنکم چندر غصّے سے بے قابو، ہو گئے۔ کرنل ڈفّن کے خلاف اُنھوں نے مقدمہ دائر کر دیا۔

"ایک دیسی آدمی نے ایک انگریز کے خلاف شکایت درج کرائی!"

"اور اُسے عدالت میں کھینچ لایا!"

بنکم چندر کی جُرأت پر سارا ملک حیران تھا۔ دور دور سے لوگ مقدّمہ سننے آتے۔ کرنل ڈفّن کو حکم دیا گیا کہ وہ معافی مانگیں۔ اور ہر شخص کو سڑک پر چلنے کا حق مل گیا۔

اس واقعہ نے انگریزوں کی ناراضگی کو اور بڑھا دیا۔ اُنھوں نے بنکم چندر کی آئندہ ترقیاں روک دینے کا فیصلہ کیا۔

جب بنکم چندر کو اس فیصلہ کا علم ہوا تو اُنھوں نے پورن چندر سے کہا۔ "مجھے اپنی عزت زیادہ پیاری ہے۔"

دو عالی دماغ

دو بڑے آدمی آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ مشہور ناول نگار بنکم چندر چٹوپادھیائے اور کیشب

چندر سین۔ برہمو سماج کے آچاریہ۔

بنکم چندر کا ملاقات کرنے کا کمرہ تھا اور وہ اپنی آرام کرسی پر اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم میری سمجھ میں بالکل نہیں آتے ہو۔" اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی حقّے کی لمبی نے کے سرے کو اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے کیشب چندر نے کہا۔

"کیا ہوا؟" وہ اکثر ملا کرتے تھے اور بنکم چندر اچھی طرح جانتے تھے کہ کیشب چندر کسی اُلجھے ہوئے مسئلہ پر گفتگو اسی طرح شروع کرتے ہیں۔ "ہاں تو پیارے کیشب اب کیا مسئلہ درپیش ہے"۔

"تعلیم اور سماج سُدھار کے بجائے کیا کوئی ملک کبھی بھی آزادی حاصل کر سکتا ہے؟"

"بالکل دُرست"۔

"تو پھر تم ہمارے ساتھ شامل کیوں نہیں ہوتے۔"

"یار کیشب! تم مجھے غلط سمجھتے ہو۔ میرے ناولوں میں بیواؤں کی شادی، عورتوں کی تعلیم اور دوسرے سماجی معاملات کا اکثر ذکر ہوتا ہے۔ ایک مصنف (تصنیف کرنے یا لکھنے والا) اپنی کتابوں میں جیتا ہے۔ اُسے جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ اپنے تخلیق کیے ہوئے کرداروں کی زبان سے کہلواتا ہے۔"

"اگر تمہاری سوچ یہ ہی ہے بنکم، تو مجھے یہ بتاؤ کہ صرف لکھ لکھ کوئی کتنا کچھ کر سکتا ہے؟"

بنکم چندر کی آنکھوں میں ایک چمک سی آئی اور وہ مسکرائے۔ کیشب چندر کو کالج کا زمانہ یاد آگیا۔ کوئی سخت سا سوال پوچھے جانے پر بنکم چندر مسکرادیا کرتے تھے۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر صرف ایک بات بھی لوگوں تک اُن کی اپنی زبان میں پہنچادی جائے تو اُس کے نتیجے اس سے زیادہ نکلیں گے جتنے انگریزی میں کی گئی ہماری ساری تقریروں

سے کبھی بھی نکل پائیں۔ میں لوگوں کے لیے اُن کی اپنی زبان میں لکھتا ہوں۔ لوگوں تک اپنی بات پہنچانے کے کام کو اور بہتر بنانے کے لیے میں نے ایک رسالہ بھی نکالنا شروع کر دیا ہے۔"

"تو آپ انگریزی زبان استعمال کرنے کے خلاف ہیں؟"

"جس طرح ہمیں اپنے صوبے کے لوگوں سے اُن کی زبان میں بات کرنی چاہیے اسی طرح ہندوستان کی دوسری زبانیں بولنے والوں کو بھی ہمیں اپنی بات سمجھانی چاہیے اور حکمراں قوم کے لوگوں کو بھی۔ جب تک مختلف صوبوں کے لوگ ایک دوسرے کو نہ سمجھیں اور نہ سمجھائیں اور سب مل کر انگریزوں پر اثر نہ ڈالیں اُس وقت تک ہندوستان کے لیے کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی۔"

کیشب چندر نے ان باتوں پر غور کرتے ہوئے حُقّے کا ایک کش لگایا۔ "اپنے اداریوں (جو مضمون ایڈیٹر لکھتا ہے) میں تم سیاست اور سماج اور آج کے ادب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہو۔ سائنس پر تمہارے مضمون پہلے ہیں جو ہندوستان کی کسی بھی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ نئی نسل پر تمہارا بہت اثر ہے۔ ملک کو 'ماں' کہہ کر تم نے اُن میں وطن سے محبت کا ایک جذبہ اُبھارا ہے۔ تمہارے خیال میں اس 'ماں' کی جغرافیائی یں کیا ہیں؟"

بنکم چندر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگے۔ سوچ میں ڈوبی اُن کی نگاہیں جھلمل کرتے تاروں کو تکنے لگیں۔ "ابھی مجھے بہت کچھ لکھنا ہے۔ بہت دور جانا ہے۔" اُن کی آواز اتنی دھیمی تھی جیسے خود سے کچھ کہہ رہے ہوں۔ اُس دن کیشب چندر کے اِس سوال کا اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

☆ ☆ ☆

رات بیت گئی آسمان پر صبح کی سپیدی پھیلنے لگی۔

سب سو رہے تھے۔ صرف بنکم چندر میز پر بیٹھے اپنے رسالے کے لیے ایک مضمون کی

نوک پلک ٹھیک کر رہے تھے۔ یکایک اُنھوں نے قلم رکھ دیا۔ میز کی دراز کھول کر اُس میں سے تہہ کیا ہوا ایک کاغذ نکالا۔ آہستگی کے ساتھ اُنھوں نے اُس کاغذ کو کھولا اور لیمپ کی روشنی میں رکھا۔ اس پر ایک گیت لکھا تھا۔ ایک سال بیت گیا تھا لیکن وہ ابھی تک طے نہیں کر پائے تھے کہ اس گیت کو پیش کیسے کریں۔ اُنھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا تھا، اب وہ ناول نگار تھے۔

شاید کیشب کے سوال کا یہ جواب ہے۔ شاید یہ اس بات کو ظاہر کر سکے گا کہ 'مادرِ وطن' زمین کے ایک خاص ٹکڑے یا لوگوں کی ایک خاص جماعت سے بڑھ کر کچھ ہے۔

بنکم چندر نے پڑھنا شروع کیا۔

"وندے ماترم!

سُجلم، سُپھلم، ملایاجا شیتلم،

شیسیہ شیاملم، ماترم!

شُبھ راجیو تسنا، پُلا کتایامنم،

پھُلاّ کسمِتا۔ دُرما دَلاشو بھنم،

سُہاسنم، سمدھر ا۔ بھاسنم،

سکھدم، ورَدم، ماترم!

☆ ☆ ☆

پہلا بند پڑھ کر وہ رُک گئے۔ کیا وہ اسے چھاپ دیں؟۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر پائے۔ کاغذ کو اُنھوں نے واپس دراز میں رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

کلکتہ یونی ورسٹی کے پرانے طالب علموں کے مل بیٹھنے کا جلسہ تھا۔ جلسہ کا انتظام کرنے

والوں میں ستیندر ناتھ ٹیگور بھی تھے۔ مہمانوں کی خاطر مدارات میں مدد کرنے کے لیے انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی رابندر ناتھ ٹیگور کو بھی بلایا تھا۔ لیکن ہال مشہور ہستیوں سے اتنا بھرا تھا کہ رابندر حیران کھڑے دیکھتے رہے۔

ایک کونے میں ورناکیولر (مقامی زبانوں کے) پریس ایکٹ کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی۔ انگریز کسی بھی مضمون پر پابندی لگا دیتے تھے کہ یہ نہیں چھاپا جائے گا۔ چھاپنے کی آزادی بالکل تھی ہی نہیں۔ ان حالات کو کب تک جاری رہنے دیا جائے؟

کچھ لوگ دیسی لوگوں کی شادی کے قانون اور برہمو سماج کے کاموں پر بحث میں مصروف تھے۔ ایک کونے میں ایک شخص اپنے دوستوں کو شری رام کرشن پرم ہنس سے اپنی ملاقات کی تفصیل بتا رہا تھا۔

ماحول میں نئے نئے خیالات اور نئی نئی توقعات کے کوندے لپک رہے تھے (جیسے بجلی کوندتی ہے۔)

یکایک رابندر ناتھ کی نگاہ ایک شخص پر پڑی جو سب سے الگ تھلگ کھڑا تھا۔ طویل قامت، صاف رنگ، ارادے کی پختگی کو ظاہر کرتی ستواں ناک، ایک دل آویز شخصیت، مجمعے میں شامل ہوتے ہوئے بھی سب سے الگ۔ اُس کی تیز نگاہ اور دھیمی مُسکان نے رابندر ناتھ پر جادو سا کر دیا۔

یہ کون ہو سکتا ہے؟

ہال میں بہت سے لوگ تھے جنھیں وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن کسی اور نے اُس کی توجہ اپنی طرف نہیں کھینچی جیسی اپنے نرالے پن اکیلے کے ساتھ اس شخص نے رابندناتھ نے پوچھنے کے لیے اپنے بھائی کو تلاش کیا لیکن وہ مہمانوں کے ساتھ مصروف تھے۔ آخر جب موقع ملا تو اُنھیں جواب ملا ''یہ بنکم چندر چٹوپادھیائے ہیں۔''

مارے خوشی کے رابندر ناتھ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایک مدّت سے اُنھیں اس عظیم شخص کو دیکھنے کی تمنا تھی۔ اُنھیں یاد آیا کہ بنکم چندر کی تازہ ترین کتاب کا وہ کتنی بے تابی

کے ساتھ انتظار کیا کرتے تھے۔ اور جیسے ہی وہ اُن کے ہاتھ لگتی، سکون سے پڑھنے کے لیے اُسے لے کر وہ چھت پر بھاگ جاتے تھے۔

کپال کنڈل، بش برکھو، چندر شیکھر، راج سنگھ، ان کو پڑھنے میں اُنھیں کتنا مزا آتا۔ ان کے مصنف کے بارے میں وہ کتنی حیرت سے سوچا کرتے تھے۔ اور اب وہ اُن کے سامنے تھا۔ مجمع میں سب سے الگ، جیسے اُس کی تحریر ہوتی ہے۔ اُس شام نوجوان رابندر ناتھ، بنکم چندر ہی کو دیکھتے رہے۔ جب مہمان رخصت ہونے لگے تو کئی لوگوں نے اُن کی اگلی کتاب کے بارے میں اُن سے پوچھا۔

بنکم چندر ہر بار صرف مُسکرا دیتے اور لوگ اندازے لگاتے ہی رہ جاتے۔

قومیت کا نعرہ

اُن کی اگلی کتاب تھی 'آنند مَٹھ'۔ بندے ماترم کا گیت اسی میں چھپا تھا۔ چار سال انتظار کرنے کے بعد بنکم چندر وہ موقع نکال سکے جہاں وہ اس گیت کو جگہ دے سکتے تھے۔ فوراً ہی ناول کا ترجمہ ہندی، گجراتی، تامل اور تیلگو میں ہو گیا۔ اور 'وندے ماترم' پورے ملک میں گونجنے لگا۔ جیسے لوگوں نے مل کر اپنی مرضی سے اسے قومی گیت مان لیا ہو جس میں اُن زنجیروں کو توڑ ڈالنے کا نعرہ دیا گیا تھا جو ہندوستان کو جکڑے تھیں۔

1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی اور 'وندے ماترم' قوم پرستوں کا نعرہ بن گیا۔

"آنند مٹھ کی کہانی آپ نے کیسے سوچی؟"

بنکم چندر سے جب یہ سوال پوچھا گیا تو اُنھوں نے جواب دیا "میں نے اسے بچپن میں اپنے میجو ٹھاکر دا سے سنا تھا۔ یہ سنّیاسی انقلاب کے بارے میں تھی۔ میں نے اس خیال کو پھیلا کر اُسے ناوِل کی صورت میں پیش کرنے کے لائق بنا دیا۔"

اُس کے بعد 'دیوی چودھرانی' اور 'سیتارام' ناول شائع ہوئے۔ دونوں کی بنیاد تاریخی

واقعات پر تھی۔ اُنھوں نے قومیت کے جذبے کو اور بڑھایا۔

1891 میں بنکم چندر سرکاری ملازمت سے سُبک دوش (رٹائر) ہوئے۔ اُن کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ 1894 کے شروع میں وہ سخت بیمار پڑ گئے۔

"آپ نے دوا نہیں کھائی؟" راج لکشمی دیوی نے کہا۔

الزام بھری نگاہوں سے مُرلی کو دیکھتے ہوئے بنکم چندر نے کہا۔ "میرے خیال میں اِس نے تم سے کہا ہو گا۔"

"جی۔ لیکن آپ کو اپنی دوا برابر لیتے رہنا چاہیے"۔

"لیکن اپنی دوا میں لے تو رہا ہوں۔"

"کہاں؟ شیشی تو بھری رکھی ہے۔" راج لکشمی دیوی بولیں۔

"یہ رہی میرے پاس۔" بنکم چندر نے بستر پر رکھی ہوئی فلسفے کی کتابوں کی طرف اطمینان سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پچھلے کچھ دنوں سے ہندو فلسفے میں وہ دلچسپی لینے لگے تھے۔ یہ ہی اُن کی دوا تھی۔

اُن کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ "آپ کو ٹھیک ہو جانا چاہیے۔ آپ کو لکھنا ہے۔"

"لکھ چکا میں جو لکھنا تھا............ سوائے۔"

"سوائے کیا؟"

"سوائے رانی جھانسی پر ایک کتاب کے...... اُس کی مثالی جرأت کا میں گرویدہ (بہت پسند کرنے والا) ہوں۔"

پورن چندر ایک خط لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ "دادا (بڑے بھائی) انگریزوں نے آپ کو سی۔ آئی۔ ای (ہندوستانی ایمپائر کا ساتھی) کے خطاب سے نوازا ہے۔ وِدّیا ساگر کے

بعد آپ ہی ہیں جن کو یہ خطاب ملا ہے۔" وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے۔

"پیارے بھائی! کیا یہ خوش ہونے کی بات ہے؟" بنکم چندر نے پوچھا۔

"کیوں نہیں؟ یقیناً ہے"۔

بنکم چندر کو یہ بات کرنی مشکل ہو رہی تھی۔ اُن کی سانس تیز چل رہی تھی۔ اور آواز بہت ہلکی نکل رہی تھی۔ "انگریزوں کی بخشی ہوئی عزّت ہمارے لیے غلامی کی علامت ہے۔ وہ حاکم کی حیثیت سے ہمیں 'اعزاز' بخشتے ہیں۔ یہ خطاب ہم سے اُن کے رشتے کو ظاہر کرتا ہے۔ آقا اور غلام کے رشتے کو۔"

کچھ دیر وہ خاموش رہے۔ پھر بولے۔ جیسے خود سے بات کر رہے ہوں۔ "آدمی اپنا زندگی کا کرتا کیا ہے؟"

سوال جو اُنھوں نے بچپن میں اپنے آپ سے پوچھا تھ۔

"سچ کو جاننے کے لیے علم حاصل کرنا اور جسے سچ سمجھے اُس کے مطابق زندگی بسر کرنا۔"

لگاتار بولتے رہنے سے اُن کے ماتھے پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے۔ اُنھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُن کا چہرہ پُر سکون تھا۔

۸ر اپریل 1894 کو بنکم چندر دنیا سے چل بسے۔

سدا حوصلہ بڑھانے والا

لیکن 'وندے ماترم' باقی ہے۔

ہمارے گانے میں۔ ہمارے خیالوں میں۔

اس نعرے نے قومی تحریک میں ایسی جان ڈال دی کہ انگریزوں نے اس کے گائے جانے پر پابندی لگا دی۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے اس گیت کی دھن بنائی اور 1896 میں، سرکاری حکم کی خلاف

ورزی کرتے ہوئے، کانگریس کے اجلاس میں، حاضرین کے اصرار پر اِس گیت کو گایا۔

سُریندر ناتھ بنرجی، سری آروبندو، بپن چندر پال، اور بال گنگا دھر تلک سب موجود تھے۔ سارے مجمع نے مل کر گایا۔ آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والوں نے ہر رُکاوٹ کا مقابلہ 'وندے ماترم' کے نعرے لگا کر کیا۔ انگریز اکثر حیران ہوتے تھے کہ اِن دو لفظوں میں کیا جادو بھرا ہوا ہے!

اور پھر 1947 آگیا۔

ہندوستان کو آزادی مل گئی۔

بابو راجندر پرشاد پہلے صدر چنے گئے۔ راشٹر پتی بھون کے سامنے ہزاروں لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ وندے ماترم۔

موسم بدلتے رہتے ہیں۔ گزرا ہوا کل ماضی بن جاتا ہے۔ گئے دنوں جب ہندوستان پر سردیاں چھائی تھیں تو ایک پنچھی نے آکر آنے والی بہار کی خوش خبری سنائی تھی۔ سوتوں کو جگادینے والی اُس کی آواز دور دور تک گونجی تھی۔ لوگوں کو پکارتی اور اُن کے دل بڑھاتی ہوئی۔

بہار کے اُس پہلے پنچھی، بنکم چندر کو ہم آج بھی یاد کرتے ہیں۔ جب کبھی 'وندے ماترم' گیت یا نعرے کی شکل میں سنائی دیتا ہے۔ ہم دل ہی دل میں اس عظیم انسان کو سلام کر لیتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

بنکم چندر کے انتقال کے بعد سری آروبندو نے اُنھیں اِن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔

"عظیم ترین ناوِل نگار، بنکم نے اپنی پہلو دار شخصیت کو انتہائی بلندی تک پہنچایا۔

"عالم، شاعر، مضمون نویس، ناوِل نگار، فلسفی، قانون داں، ناقد (کسی تحریر کی جانچ

کرنے والا) سرکاری افسر، زباں داں، اور مذہب میں اصلاح کرنے والا۔ اُس کے اکیلے دماغ میں پوری دنیا سمائی تھی۔

"زبان پر اُسے پوری قدرت تھی، قانون اُس کے مزاج میں داخل تھا۔ وہ سرکاری تحریریں نہایت عمدہ اور نثر بے مثال لکھتے تھے۔ وہ سرکاری امتحان بھی پاس کر لیتے اور ظلم اور زیادتی کو جڑ سے بھی اُکھاڑ پھینکتے تھے۔ وہ ایک طرف مابعد الطبیعات (میٹافزکس) کے مشکل مسئلوں اور دوسری طرف لفظ کی بناوٹ کی باریکیوں سے بھی جھوجھ لیتے۔ زندگی کی محسوس کی جاسکنے والی حقیقتوں کو اور مذہب کی نازک روحانیت کو ایک جیسی آسانی کے ساتھ سمجھ لیتے تھے۔ وہ زبان کے قاعدے بھی سیکھ سکتے تھے اور نظم بھی لکھ سکتے تھے۔

"چالیس سال کے اپنے ذہنی کارناموں میں اُنھوں نے ہمارے لیے دس ناول، مذہب کا جائزہ لینے والی دو کتابیں اور اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے کچھ دوسرے ادبی کام چھوڑے۔ گنتی میں کم، خوبی میں خالص سونا۔ ہو سکتا ہے وہ اس سے زیادہ لکھتے بھی نہیں۔

"قدرت ہمیں کنکر پتھر اَن گنت تعداد میں اور ملی جلی دھاتیں کافی مقدار میں دیتی ہے۔ لیکن خالص سونا، مہین مہین ذرّوں کے بہت چھوٹے چھوٹے ذخیروں کی صورت میں بخشتی ہے۔"

اینّی بیسینٹ

جے۔ رادھا کرشنن

"پہلی جو بات اُنھیں یہاں عجیب سی لگی ہوگی وہ یہ کہ اگرچہ خود تو ہمارے وطن کے زندگی بسر کرنے اور سوچنے کے پرانے طریقوں کی بڑی تعریف کرتی ہوئی اور اُنھیں سراہتی ہوئی وہ یہاں آئی تھیں اور ہمارے سورما مردوں اور عورتوں کی داستانوں اور ہماری دیومالا سے وہ اچھی طرح واقف تھیں لیکن ہمارے جن پڑھے لکھے لوگوں سے بھی وہ ملتیں وہ سب ان باتوں کو نہ صرف جانتے نہیں تھے بلکہ اُن کو پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی پُرانی اور متبرک روائتوں کو وہم پرستی اور ناسمجھی کی حماقتیں سمجھتے تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مغربی طریقوں کی نقل کرنے میں ہی اُن کا اور اُن کے ملک کا بھلا ہو سکتا ہے۔ مسز بیسینٹ نے اپنے دل میں یقیناً سوچا ہوگا کہ شک و شبہ اور دکھاوے کے نئے پن کی اس لہر کو فوراً روکنا ہوگا اور لوگوں کے ذہن میں اپنے ملک کی روایت کی قدر اور اپنے بزرگوں کے عظیم کارناموں کی محبت پھر سے پیدا کرنی ہوگی تاکہ خود اپنی عزّت اور اپنے اوپر بھروسہ اور فخر کا وہ جذبہ اُن میں رچ بس جائے جو کسی بھی قوم کو عظیم ٹھہرایا کرتا ہے۔"

سری پرکاش

اینّی بیسینٹ

ہندوستان سے بہت دور، انگلستان میں 8/اکتوبر1847 کو ایک بچّی پیدا ہوئی۔ وہ دوسرے بچّوں جیسی ہی تھی، ہنستی، روتی اور دوسرے بچّوں کی طرح دھوپ میں ناچتی کودتی۔

کون سوچ سکتا تھا کہ یہ بچّی۔ اینّی۔ بڑے ہو کر ایک دن انسان دوست کی حیثیت سے عالم گیر شہرت حاصل کرلے گی اور نئے ہندوستان کے بنانے والوں میں سے ایک ہوگی۔

شاعرہ، محبِّ وطن' اور آزادی کی مجاہد مسز سروجنی نائیڈو نے کہا" اینّی بیسینٹ اگرچہ پیدائش کے اعتبار سے غیر ملکی تھیں مگر وہ ہم سب سے زیادہ سچّی ہندوستانی تھیں۔ انھوں نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں کوئی بھی قربانی بہت بڑی نہیں سمجھنی چاہیے۔ اُن کی لگن اُنھیں ملک کے کونے کونے میں لیے پھری۔ اُنھوں نے لوگوں کے مردہ دلوں کو جھنجھوڑا اور اُن میں پھر سے جان ڈالی۔"

شروع کی زندگی

اینّی بیسینٹ کی پہلے کی زندگی کیسی تھی؟ وہ ہندوستان کیوں آئیں؟ ہمارے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد کے لیے یہاں کے لوگوں کو اُبھارنے پر اُنھیں کس بات نے اُکسایا؟

اینّی کے والد انگریز تھے۔ اُن کی ماں آئرلینڈ کی رہنے والی تھیں۔ اینی کے ایک بھائی بھی تھا۔ وہ پانچ سال کی بھی نہیں ہوئی تھیں کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور بچّوں کو تعلیم دلانے کے لیے اُن کی ماں کو کام پر لگنا پڑا۔

اُس زمانے کے رواج کے مطابق جلد یعنی جب وہ بیس سال کی تھیں تو 1867 میں ایک

پادری ریورینڈ فرینک بیسینٹ سے اُن کی شادی ہو گئی۔ اُن کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے۔

اینی بیسینٹ صرف گھرداری کے کاموں میں اُلجھے رہنے کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا چاہتی تھیں۔ وہ اتنی بجھی بجھی رہنے لگی تھیں کہ اُنھوں نے ایک دن زہر کھا کر مر جانے کی ٹھان لی۔ لیکن وہ زہر پھانکنے ہی والی تھیں کہ اُنھیں لگا کہ کوئی غیبی (نگاہوں سے چھپی ہوئی ،غائب) آواز اُن سے چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے۔

"بزدل کہیں کی، کیا تو مصیبتوں کو چند برس اور نہیں جھیل سکتی؟"

اس کے بعد ان کی زندگی نے پلٹا کھایا۔ اور اینی بیسینٹ نے اپنے سامنے آنے والی ہر مشکل کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کرنے، کبھی مایوس نہ ہونے اور اُمید کا دامن کبھی نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

1873 میں ایک سخت مرحلہ پیش آیا۔ اینی بیسینٹ اپنے شوہر سے علیحدہ ہو گئیں۔ اُنھیں اپنے بیٹے کی پرورش اُس کے باپ کو سونپنی پڑی۔ بیٹی اُن کے پاس رہی۔

اینی محبت کرنے والی ایک ماں تھیں۔ ننھی سی بیٹی سے اُنھیں وہ سکون مل جاتا تھا جس کی ضرورت اُن کے بے چین دل کو تھی۔ اُنھوں نے اپنی ہی لکھی ہوئی سوانح حیات میں لکھا۔ "مُنّی کا ساتھ ہونا میرے لیے اچھا ہوا۔ وہ میرے دکھی دل کو زندہ رکھے ہوئے تھی۔ جب میں کام کرتی ہوتی تو وہ گھنٹوں اطمینان سے کھیلتی رہتی۔ کبھی کبھار ایک آدھ لفظ اُس سے کہہ دینا اُس کی خوشی کے لیے کافی ہوتا۔ جب کبھی اُسے چھوڑ کر مجھے گھر سے جانا ہوتا تو وہ دوڑتی ہوئی میرے ساتھ دروازے تک آتی اور بسورتے ہونٹوں سے خدا حافظ کہتی۔ وہ کھڑکی سے لگی میری واپسی کا انتظار کرتی رہتی۔ گھر آنے پر سب سے پہلے اُس کا کھلا ہوا چہرہ میرا استقبال کرتا۔ کبھی میں تھکی ہوئی، بھوکی اور رنجیدہ گھر لوٹتی تو میری راہ تکتے منّے سے چہرے کی ایک جھلک مجھے یاد دلا دیتی کہ اپنی دلاری کو دکھی ہونے سے بچانے کے لیے مجھے اپنے چہرے سے تھکاوٹ اور پریشانی کے آثار ہٹا دینے چاہئیں۔ اور یہ کوشش مجھے واقعی تر و تازہ کر دیتی۔

تحریر و تقریر

اپنے مشکل حالات کی بنا پر اکثر اُن پر مایوسیوں کے دورے پڑتے اور اُن کی طبیعت بجھی بجھی سی رہا کرتی۔ اپنی اِس کیفیت کو دور کرنے کے لیے وہ لکھنے بیٹھ جاتیں۔ اس سے اُنھیں یہ بھی پتہ چلا کہ اچھا لکھنے کی صلاحیت اُن میں موجود ہے۔ لکھنے کی اس صلاحیت کی بنا پر وہ اتنا کمانے لگیں کہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکتی تھیں۔

اچھا لکھ لینے کی وجہ سے ہی اُن کی ملاقات 'چارلس بریڈلا' سے ہوگئی جو تبدیلی چاہنے والے ایک سیاست داں اور انگلستان میں آزاد خیالی کی تحریک کے رہنما تھے۔ آزاد خیال لوگ کسی بات کو محض اس لیے ٹھیک یا سچ نہیں مان لیتے تھے کہ مذہبی عالم اُسے صحیح بتاتے تھے۔ کسی سند کے بجائے دلیلوں کی بنا پر ہی وہ اپنی رائے قائم کرتے تھے۔

لوگوں کو آزاد خیالی کی سوچ سمجھ بتانے، سمجھانے اور منوانے کے کام نے اینی بیسینٹ کی تقریر کرنے اور رہنمائی کرنے کی صلاحیتوں کو نکھار دیا۔ جلد ہی وہ ایک جوشیلی اور آتش بیان مقرر بن گئیں۔ اُن کی تقریر سننے والے دم بخود رہ جاتے۔

اس سے زیادہ یہ کہ جن باتوں کو وہ سچ سمجھتیں اُن کا اور ستائے ہوئے، بے سہارا لوگوں کی زندگی کو جلدی سے جلدی بہتر بنانے کی اپنی زبردست دلی خواہش کا اظہار وہ بڑی جرأت اور ہمت کے ساتھ کرتی تھیں۔

اُن کی تقریر کے جادو، اور مذہبی کٹر پن کے خلاف اُن کی آتش بیانی نے اینی بیسینٹ کو عوام میں مقبول رہنما بنا دیا۔ "لوگ خاموش رہتے ہیں۔ اُن کی اس خاموشی کی وکالت میں کروں گی۔ گونگوں کی طرف سے میں بولوں گی۔ میں چھوٹے لوگوں کی طرف سے بڑے لوگوں سے، کمزور لوگوں کے بارے میں طاقتور لوگوں سے بات کروں گی۔ میں سارے چپ سادھے ہوئے ناامّید لوگوں کی طرف سے بات کروں گی۔" اینی بیسینٹ گرجتیں، زوردار تالیوں کی گونج میں۔

جب وہ پوری دنیا پر نظر ڈالتیں تو اِس کو بہتر جگہ بنانے اور انسانوں کو اونچے درجے پر

پہچانے کی شدید خواہش اُن کے دماغ پر چھا جاتی۔ خود اپنے الفاظ میں "وہ کوشش کرتیں کہ غریبوں کے دکھوں کی آہ وزاری کو اُن لوگوں کے کانوں تک پہنچا دیں جو کچھ سوچتے ہی نہیں، جو لاپرواہ ہیں۔"

جھگی جھونپڑیوں سے شہر کی سڑکوں پر آکر وہ سوچتیں کہ خوبصورتی کو ہولناک بدنمائی سے جدا کرتے ہوئے بس یہ چند قدم کے فاصلے، لوگوں کے مقدّروں میں زبردست فرق کو کتنی واضح کر دیتے ہیں۔ "اس سلسلے میں جلد کچھ کرنے کے لیے یہ سوال اُن کے کانوں میں گونجنے لگتے، 'کیا کوئی علاج نہیں'؟، کیا غریب اور امیر، ہمیشہ ہی رہیں گے'؟، بعض لوگ کہتے ہیں ایسا ہی ہوگا۔ "روشنی اور سایے کی طرح محل اور جھونپڑے سدا ساتھ رہیں گے۔ میں اس کو نہیں مانتی۔ مجھے یقین ہے کہ غریبی، جہالت اور خراب سماجی نظام کی پیداوار ہے اور اس لیے علم اور سماجی تبدیلی کے ذریعے اسے دور کیا جا سکتا ہے۔"

فےبین سوسائیٹی

اپنے مجاہدانہ جذبے کی نشوونما کی اس منزل پر اُن کی دوستی مشہور مصنف اور سوشلسٹ مفکر جارج برنارڈ شا سے ہوگئی۔ اس دوستی نے 1885 میں نے فےبین سوسائٹی میں شامل ہو جانے میں اُن کی مدد کی۔ وہ سوسائٹی کے شروع کے ممبروں میں سے ایک تھیں۔

فےبین سوسائیٹی سماج کا سدھار چاہنے والوں کی جماعت تھی جس کے رہنما سڈنی اور بیٹ رائس ویب اور پیتھک لارنس تھے (پیتھک لارنس بعد میں اُس کیبنیٹ مشن کے سربراہ تھے جو 1946 میں ہندوستان بھیجا گیا تھا اور جس نے ہندوستان کی آزادی کی راہ ہموار کی تھی۔) اس سوسائٹی کے ممبر عام لوگوں کی رائے کو اتنا طاقتور بنا دینا چاہتے تھے کہ وہ برطانیہ اور برطانیہ کی نو آبادیات میں بسنے والے غریب اور بے سہارا لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ضروری اقدامات کرنے پر ریاست کو مجبور کر سکے۔

برطانیہ میں مزدور عورتوں کی پہلی ٹریڈیونین کو قائم کرنے میں کامیاب ہو جانے کے بعد اینی بیسینٹ بہت مشہور ہو گئیں۔ برطانیہ کی ایک مشہور ماچس بنانے والی فیکٹری میں کام

کرنے والی لڑکیوں کی کامیاب ہڑتال منظم کرانے کے بعد یہ یونین بنی تھی۔ اینی بیسینٹ کی کوششوں سے ان مزدور لڑکیوں کے کام کرنے کے حالات بہتر ہوئے۔

بعد میں لندن کے اسکول بورڈ کی ممبر کی حیثیت سے اینی بیسینٹ نے انتھک کوشش کی کہ انگلستان میں سب کے لیے مفت تعلیم رائج ہو۔

1889 میں مسز اینی بیسینٹ کی عوامی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلی آئی۔ ایک فیبین سوشلسٹ لیڈر کی حیثیت سے جب وہ اپنی شہرت کے عروج پر تھیں تو میڈم ہیلنا پٹرونا بلاواتسکی، سے متاثر ہوکر، جنھوں نے تھیوسوفکل سوسائیٹی قائم کی تھی، اینی بیسینٹ اچانک اس سوسائیٹی میں شامل ہو گئیں۔ اُن کی تمام دوست اور مداح حیران رہ گئے۔

جارج برنارڈ شانے، جن سے اینی بیسینٹ اکثر صلاح اور مشورہ لیا کرتی تھیں، اس تبدیلی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا۔ ''مسز بیسینٹ ایک دم سے فیصلہ کر لینے والی خاتون ہیں۔ اُنھوں نے بہت سی تحریکوں اور سوسائیٹیوں کے نمونے آزمائے تب جاکر وہ اپنے آپ کو پا سکیں۔ ایک طرح کے تحریک سے دوسری طرح کی تحریک تک وہ دھیرے دھیرے نہیں پہنچتی تھیں۔ وہ ہر اگلی تحریک میں دھم سے کود پڑتی تھیں اور فوراً نئے اعتقادات کی تبلیغ شروع کر دیتی تھیں۔ اُن کے سننے والوں کو اس کا گمان بھی نہ ہوتا کہ پُرانے اعتقادات کی وہ اب قائل نہیں رہی ہیں۔''

جس چیز نے اینی بیسینٹ کو تھیوسوفکل سوسائیٹی کی طرف مائل کیا۔ وہ اس تنظیم کے انوکھے مقاصد تھے۔ یعنی نسل اور مذہب کا فرق کیے بغیر ایک عالمی بھائی چارے کو قائم کرنا۔ انسان کے اندر سوئی ہوئی جسمانی قوّتوں اور قدرت کے انجانے اصولوں کی کھوج اور جانچ پڑتال کرنا۔ اور مشرقی ملکوں کے اور آریاؤں کے ادب اور فلسفے کے مطالعے کو عام کرنا۔ اپنی مذہبی رائے کے معاملے میں سوسائیٹی کے ممبر پوری طرح آزاد تھے۔

اگرچہ اینی بیسینٹ تھیوسوفی پر ایمان لے آئی تھیں لیکن دنیا کے تمام انسانوں سے اُن کا زبردست جذباتی لگاؤ برقرار رہا۔

سخت محنت کرنے کی اپنی پُرانی شہرت برقرار رکھتے ہوئے وہ جلد ہی تھیوسوفی کی ایک

ذہین مبلغ (تبلیغ کرنے، پھیلانے والی) بن گئیں، مقرر اور مصنف دونوں حیثیتوں سے۔ 1891 میں میڈم بلاواتسکی کے انتقال کے بعد سوسائٹی کی رہنمائی کی ذمہ داری بھی اینی بیسینٹ نے سنبھالی اور یورپ، امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں ہر جگہ اُس کی شاخیں قائم کر کے اُسے ایک عالمی تنظیم بنادیا۔

ہندوستان

یہ تھیوسوفی ہی اینی بیسینٹ کو 1893 میں ہندوستان لائی۔ 1879 کے آس پاس تھیوسوفکل سوسائیٹی نے اپنے اہم کاموں کو انگلستان سے ہندوستان میں منتقل کردیا تھا۔ یہاں مدراس شہر کے اڈایار علاقے میں سمندر کے کنارے ایک لمبا چوڑا، ہرا بھرا باغ سوسائیٹی کو خوش آمدید کہنے والا ایک پُر سکون گھر بن گیا۔

فیبین سوشلسٹ سوسائیٹی میں شامل ہونے کے بعد ہندوستان سے فطری لگاؤ اُن کے اندر ریلتا رہا تھا۔ ہندوستان پہنچنے کے پہلے دن سے ہی اُس کا اظہار ہونے لگا۔

اینی بیسینٹ نے اپنے رہن سہن اور لباس وغیرہ کو جہاں تک بھی ممکن ہو سکا ہندوستانی بنانے کی کوشش کی۔ ''تاکہ اُن کی پہنچ ہندوستان کے لوگوں کے دل تک ہو سکے۔'' وہ نہ صرف ہندوستانیوں کے ساتھ رہتیں بلکہ اُن ہی کی طرح رہتیں۔ ہر وقت ساڑی پہنے رہتیں۔ اور زمین یا تخت پر آلتی پالتی بیٹھ کر کام کرتیں۔ کرسی میز کے بجائے ٹھیٹ ہندوستانی طریقے سے زمین پر بیٹھ کر، چھری کانٹے کے بجائے ہاتھ سے کھانا کھاتیں۔ وہ ہر ایک سے یہی کہا کرتی تھیں کہ ہندوستانی طور طریقے اُنھیں اپنے لیے بالکل فطری سے لگتے ہیں۔

ہندوستان کے لوگوں اور اُن کی تہذیب سے مکمل یگانگت اُن میں کہاں سے آئی؟ اس کا اتہ پتہ اینی بیسینٹ کی خود نوشت میں ملتا ہے (جو اُن کے ہندوستان آنے سے پہلے شایع ہو چکی تھی۔) ''میں نے پچھلے کئی جنم ہندوستان میں لیے ہیں۔ 1847 میں لندن میں پیدا ہونے سے پہلے کے جنم میں بھی میں ہندوستانی ہی رہی تھی۔ اُس کے ختم ہونے اور موجودہ

جنم کے شروع ہونے میں صرف تین سال کا وقفہ ہے۔"

اُن کے قریبی دوستوں کا بیان ہے کہ اپنے بچپن میں بھی وہ ہندوستان ہی کو اپنا وطن بتایا کرتی تھیں۔ جب انگلستان کے ایک مشہور پبلشر نے "ینگ فوکس (بچّوں کی) لائبریری کے واسطے کہانیوں کے ایک سلسلے کے لیے اُن سے کوئی کہانی لکھنے کو کہا تو جو پہلی کہانی اُنھوں نے لکھی اُس کا نام تھا "گنگا اور جل پری" اس کہانی میں ہندوستان کی شاندار تہذیب اور وہاں کے لوگوں کی اعلا درجے کی کاریگری کا ذکر بڑے رنگین انداز میں کیا گیا ہے۔

اپنے "وطن" (یعنی ہندوستان) میں، خیالی طور پر نہیں بلکہ واقعی آجانے کے بعد اُن کے کاموں میں فرض کی ادائیگی اور بڑی کسر نفسی کا اظہار ہوتا ہے۔

ہندوستان پہنچنے کے بعد اپنے ایک بیان میں اُنھوں نے کہا کہ میں اس سرزمین کی زیارت کرنے اور یہاں کے لوگوں سے عقل کی باتیں سیکھنے آئی ہوں۔ لیکن اُنھیں یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوا کہ برطانیہ کے بے رحم نوآبادیاتی اقتدار کی وجہ سے جو انگلستان کی ہر بات کو بڑھیا اور ہندوستان کی ہر بات کو گھٹیا بتایا کرتا تھا، ہندوستان اپنے پُرانے وِرثے کو چھوڑ بیٹھا تھا۔

اس لیے اینی بیسینٹ خود اپنی استانی بنیں۔ پہلے اُنھوں نے متبرک سنسکرت زبان میں مہارت حاصل کرنے کی ٹھانی۔ ہندوستان آنے سے پہلے وہ اس زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتی تھیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اُنھوں نے اتنی مہارت حاصل کرلی کہ بچّوں بلکہ بڑوں کے لیے بھی اُنھوں نے آسان انگریزی زبان میں 'بھگوت گیتا کا ترجمہ کر ڈالا۔ اتنا عمدہ کہ آج اسّی برس بعد بھی اُس ترجمے کی مانگ سب سے زیادہ ہے۔ کم عمر بچّوں میں حُب الوطنی کے جذبے کی صحیح طور پر نشو و نما کرنے کے لیے اُنھوں نے ہندوستان کی پُرانی روایات کی کہانیاں چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں شایع کیں۔ اُن کے بعد "مذہب اور اخلاق کی عام درسی کتاب" شایع کی جس میں دنیا کے تمام بڑے مذہبوں کی بتائی ہوئی سچّائیاں شامل تھیں۔

نئی زندگی

اس کے بعد اینی بیسینٹ ہندوستان کے لوگوں میں خود اپنا احترام پیدا کرنے، اپنے ماضی

پر فخر کرنے اور اپنے مستقبل پر پختہ یقین رکھنے کی کوششوں میں لگ گئیں۔ انگلستان میں ایک فیبین سوشلسٹ کارکن رہنے کی وجہ سے وہ اچھی طرح واقف تھیں کہ برطانوی راج ہندوستان میں کیسی سیاسی، اقتصادی اور سماجی گراوٹ لایا ہے۔

ہندوستان میں پھر سے زندگی پیدا کرنے کے اپنے مقصد میں وہ جی جان سے لگ گئیں۔ تقریر کی جادوئی بیانی سے وہ پڑھے لکھے لوگوں کو یقین دلا دیتیں کہ ہندوستان کبھی ایک عظیم ملک رہا ہے اور آئندہ بھی وہ ایک بڑا ملک بن جائے گا۔ ہندوستان نے ہمیشہ دنیا کے لوگوں کو علم و دانش سکھائی ہے اور اب ایک بار پھر اُسے اپنا یہ رُتبہ حاصل کرنا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں پر اپنے ملک کی طرف سے یہی اعلا اور مقدّس فرض عاید ہوتا ہے۔ اپنی ان ذمہ داریوں کو پورا نہ کرنے میں خود اُن کی ہی تباہی ہے۔

بیماری کو پہچان لینے اور اُس کو دور کرنے کا طریقہ طے کر لینے کے بعد اینی بیسینٹ ٹھوس اقدامات میں لگ گئیں۔ ہندوستان کو پھر سے زندہ کرنے کے عملی منصوبے میں پہلا مقام ''عوام کی تعلیم کا تھا۔

اینی بیسینٹ بجا طور پر تعلیم کو تہذیب کی بنیاد قرار دیتی تھیں۔ اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق اُنھوں نے اپنی اس مہم کا آغاز مقدّس گنگا کے کنارے بنارس میں کیا۔

بنارس میں مسز بیسینٹ کی سب سے زیادہ باقی رہ جانے والی یادگار بنارس ہندو، یونی ورسٹی آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

1898 میں جب وہ قائم ہوئی تو اُس کا نام ''سینٹرل ہندو کالج'' تھا۔ مسز بیسینٹ کا شروع ہی سے یہ اصرار رہا کہ وطن سے محبت کے نظریے کو ہندوستان کے تعلیمی پروگرام کی روح ہونا چاہیے۔ مگر اُس کے ساتھ ہی مغرب میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی نئی سے نئی ترقیوں کا پورا فائدہ اُٹھانے کے لیے اُن کو اپنے تعلیمی پروگرام میں اِس طرح شامل کر لینا چاہیے کہ ہندوستان کے لوگ ہر پہلو سے ترقی کر سکیں۔

دوسری جس بات پر وہ زور دیتی تھیں یہ تھی کہ ہندوستان کی تعلیمی ترقی خود ہندوستانیوں کی اپنی کوششوں سے ہونی چاہیے۔ اس نظریے کی بنیاد پر اُنھوں نے تعلیم کے

کام میں لگے بہت سے اہم ہندوستانیوں کی عملی امداد سے یہ کالج قائم کیا۔ اور اُن پر یہ بات بار بار واضح کی کہ اُنھیں اس پہل میں ذاتی طور پر دلچسپی لینی ہوگی۔ کیوں کہ اس پہل کا کامیاب ہونا اُسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہر مرحلہ پر ہندوستان میں تعلیم کی رہنمائی ہندوستانی خود کریں۔

مسز بیسینٹ بار بار اس بات پر زور دیتیں کہ "نئے نئے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی ذمہ داری ہندوستانیوں کو اپنے کندھوں پر لینی چاہیئے۔ اور اسکول اور کالج ہندوستانیوں کے کنٹرول میں چلنے چاہئیں نہ کہ حکومت یا دوسرے ملکوں کے مشنری آکر اُنھیں چلائیں۔ جیسا کہ ہندوستان میں برطانوی راج شروع ہو جانے کے بعد سے اب تک ہوتا آرہا ہے۔"

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُن کے سوچے ہوئے منصوبوں میں تعلیم کی ایک اہم بنیاد مذہب تھا۔ اِس کے علاوہ ضرورت مندوں کی مدد کرنے کے جذبے کو بڑھانے کے لیے نوجوانوں کو سماجی کام انجام دینے کی تربیت ملنی بھی ضروری تھی۔

بنارس کالج کو ایک نمونے کا ہندوستانی تعلیمی ادارہ بنانے کی اُن کی جدوجہد میں ہاتھ بٹانے کے لیے بہت سے پُر خلوص اور لگن سے کام کرنے والے ہندوستانی خوشی خوشی آگے آئے۔ شروع کے ہاتھ بٹانے والوں میں ڈاکٹر بھگوان داس اور شری گووند داس شامل تھے۔

جب کالج کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں تو اینی بیسینٹ نے اُس کی باگ ڈور، محبِ وطن' ماہر تعلیم پنڈت مدن موہن مالویہ کو سونپ دی۔ یہ ادارہ جلد ہی 'بنارس ہندو یونی ورسٹی' کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہو گیا۔

اس زبردست کامیابی نے اینی بیسینٹ کی ہمت بڑھائی اور اُنھوں نے بنارس ہی میں لڑکیوں کا ایک اسکول قائم کیا جو ترقی کر کے ایک شاندار کالج بن گیا۔ اس نے ملک بھر میں لڑکیوں کے لیے مختلف قسم کے تعلیمی ادارے کھولے جانے کا راستہ ہموار کر دیا۔

مسز بیسینٹ کی کوشش تھی کہ موثر اقدامات کا ایسا خاکہ تیار کیا جائے جس سے عام طور پر عورتوں کی اقتصادی اور سماجی حیثیت کو اونچا اُٹھایا جا سکے اور کام کرنے والی عورتوں کے حالات کو بہتر بنایا جا سکے۔

ان پروگراموں کو شروع کرتے وقت، لوگوں کے شبہات دور کرنے کے لیے اُنھوں نے یہ بات بالکل واضح کردی کہ اُن کا مقصد ہندوستان کی عورتوں کے مزاج کو بدلنا ہرگز نہیں ہے۔ جسے وہ ''دنیا بھر میں سب سے زیادہ روحانیت رکھنے والا سمجھتی ہیں۔''

1907 میں سات سال کے لیے تھیوسوفکل سوسائیٹی کا صدر چنے جانے کے بعد اینی بیسینٹ نے اپنے کام جنوبی ہندوستان میں کرنے شروع کردیے۔ جلد ہی اُنھوں نے ایک تھیوسوفکل تعلیمی وقف، قائم کیا جس کے تحت جنوبی ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں اسکول اور کالج کھول دیے۔ بعد میں یہ وقف ''سوسائیٹی برائے فروغ قومی تعلیم'' بن گیا۔ جس کا مقصد پورے ہندوستان میں تعلیم کو حب الوطنی کی بنیاد پھر سے منظم کرنا تھا۔

نوجوانوں کے لیے پروگرام

ہندوستان کے نوجوانوں کے سوچنے سمجھنے کے انداز کو بدلنے کی ضرورت کے تحت اُنھوں نے 'نوجوانوں کی ہندوستانی ایسوسی ایشن' بنائی۔ بڑے ہو کر ایک مفید شہری بن جانے کے لیے نوجوانوں کی باقاعدہ تربیت کی سہولیات اُسے مہیاکی گئیں۔ یہ ایسوسی ایشن دراصل دنیا بھر میں مشہور ینگ مینس کرسچین ایسوسی ایشن (وائی۔ایم۔سی۔اے) کی طرح سے ہندوستان کے نوجوانوں کے لیے بنائی گئی تھی جو وائی۔ایم۔آئی۔اے۔، کے نام سے کافی مشہور ہوئی۔

جب یہ تحریک عوام میں خوب مقبول ہو گئی تو اینی بیسینٹ نے 'عورتوں کی ہندوستان ایسوسی ایشن' بنائی اور اُس کی پہلی صدر کی حیثیت سے ذاتی طور پر اُس کی رہنمائی کی۔ یہ تحریک بھی تیزی سے سارے ملک میں پھیل گئی۔ اور اس نے تعلیم، صنعت، سیاست وغیرہ کے میدانوں میں عورتوں کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے کامیاب کوشش کیں۔

نوجوانوں کے لیے مسز بیسینٹ کے پروگراموں کا سب سے اہم پہلو اُن کی وہ کوشش ہیں جو 'انڈین بوائز اسکاوٗٹ' تحریک کو منظم کرنے کے لیے اُنھوں نے کیں۔ عالمی اسکاوٗٹ تحریک کے جنم داتا لارڈ بیڈن پاویل نے یہ کہہ کر 'ہندوستانی بوائے اسکاوٗٹ' تحریک کو عالمی

تنظیم میں شامل کرنے سے انکار دیا کہ اس تحریک میں انگریز افسروں کی تعداد نہ ہونے کی برابر ہے۔

اینی بیسینٹ نے اس الزام کو ہندوستان کے لیے توہین آمیز سمجھا۔ اُنھوں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ انگریزوں کی نگرانی کے بغیر، ہندوستانی بچّوں کی، صحت، حوصلہ مندی، اچھی شہریت اور عوام کی خدمت کے لیے تربیت کا انتظام نہیں کیا جاسکتا۔

چناں چہ تربھی پرشاد سنہا اور سنجیو کامتھ جیسے رہنماؤں کی مدد سے مسز بیسینٹ نے 'انڈین بوائز اسکاؤٹ ایسوسی ایشن' قائم کردی۔ ایسوسی ایشن کے ہندوستانی کردار پر زور دیتے ہوئے اُنھوں نے اصرار کیا کہ لڑکے مغربی طرز کے ہیٹ پہننے کے بجائے سر پر پگڑی باندھا کریں گے اور ہندوستانی گیت گایا کریں گے۔ باقی اور سب معاملات میں وہ اسکاؤٹ قاعدوں کی پابندی کیا کریں گے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جب ہندوستانی اسکاؤٹ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی اور ایک بڑی تنظیم بن گئی تو بیڈن پاویل کا پھر ہندوستان آنا ہوا۔ بھارت اسکاؤٹس کی کارکردگی اور ڈرل دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ اپنی پچھلی رائے کو بالکل بدلتے ہوئے، جس سے نسلی برتری کی بو آتی تھی، اُنھوں نے اس مرتبہ خود یہ درخواست کی کہ برطانیہ کی بوائے اسکاؤٹ تنظیم اور ہندوستانی تنظیم کو ملا کر ایک کردیا جائے اور مسز بیسینٹ کی تنظیمی صلاحیت کو تسلیم کرتے ہوئے بیڈن پاویل نے اُن کو ہندوستان کا آنریری اسکاؤٹ کمشنر مقرر کردیا۔

جدّو کرِشنا مورتی

تقریباً اُسی زمانے میں ایک ناخوشگوار واقعے نے عوام میں اینی بیسینٹ کی نیک نامی کو صدمہ پہنچایا۔ دو لڑکوں کی سپردگی کے بارے میں جو ایک پکّے تھیوسوفسٹ کے بیٹے تھے، اُنھیں ایک لمبا مقدمہ لڑنا پڑا۔

بچّوں کے باپ نے اپنی مرضی سے اپنے دو بیٹوں۔ جدّو کرشنا مورتی اور نتیہ آنند کی تعلیم اور پرورش کی ذمہ داری مسز بیسینٹ کے سپرد کردی تھی۔ لیکن بعد میں اُس نے بچّوں

کو واپس لینا چاہا۔ مسز بیسینٹ اُن میں سے بڑے لڑکے، جدو کرشنا مورتی کی پرورش خود کرنا چاہتی تھی کیوں کہ اُس میں اُنھیں مسیح موعود (نئے مسیحا) کا وکیل اور انسانوں کے لیے ایک زبردست استاد بننے کے آثار نظر آتے تھے۔

باپ نے مدراس ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدمہ لمبا کھنچا اور جب فیصلہ سنانے کی نوبت آئی تو کرشنا مورتی بالغ ہو گیا۔ اپنے بارے میں اُسے خود فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا۔ لوگوں کی حیرت کی حد نہ رہی جب اُس نے اپنے باپ اور مسز اینی بیسینٹ دونوں ہی سے چھٹکارا پانے کو پسند کیا۔ اپنی الگ راہ پر چلتے ہوئے اس نے ایک نئے فلسفے کی تبلیغ شروع کر دی۔ دھیرے دھیرے اُس کی شہرت بڑھتی گئی۔ بہت لوگ اُس کے قائل ہو گئے۔ اور اُس کی باتوں کو ماننے لگے، ملک میں بھی اور ملک کے باہر بھی۔ اخلاقیات کا درس دینے والوں میں وہ یقیناً سب سے زیادہ ذہین اور زوردار نکلا۔ اُس کی صلاحیتوں کے بارے میں اینی بیسینٹ نے جو اندازے لگائے تھے وہ صحیح ثابت ہوئے۔ 1986 میں اُس کی موت پر دنیا میں بہت سے لوگوں کو صدمہ پہنچا۔

لیکن مسز بیسینٹ کی یہ کوشش کہ ہندوستان کے لوگ اپنے پرانے اعتقادات کو پھر سے صحیح ماننے لگیں برابر جاری رہیں۔ ان لگاتار کوششوں نے لوگوں میں اپنے آپ کو قابلِ عزت سمجھنے، اپنے ماضی پر فخر کرنے اور اپنے مستقبل پر بھروسہ کرنے کا احساس جگا دیا۔ اس کے نتیجے میں وطن سے محبت کا جوش بڑھا اور ایک جیتا جاگتا ہندوستان پھر سے تعمیر کرنے کے آثار پورے ملک میں نظر آنے لگے۔

1907 کے بعد سے اینی بیسینٹ کے مدراس میں مستقل قیام نے اُنھیں علاقے کے نامور دانشوروں اور اہم سیاسی رہنماؤں سے ملتے رہنے کے بہت موقعے فراہم کیے۔ انگلستان میں نے فے بین سوسائٹی سے وابستہ رہ کر وہ نو آبادیات کی مخالف ہر جدوجہد کی حامی بن گئی تھیں۔ اسی لیے نئی قائم ہونے والی انڈین نیشنل کانگریس کی طرف اُن کا کھچ آنا لازمی تھا جو ملک میں اپنا راج قائم کرنے کی لوگوں کی تمناؤں کی پیشوائی کر رہی تھی۔

مسز بیسینٹ ہندوستان کے سیاسی میدان میں 1913 میں داخل ہوئیں۔ اپنے سیاسی کام

میں مدد حاصل کرنے کے لیے اُنھوں نے 'کامن ویل' (سب کی بھلائی) نام کا ایک ہفتہ وار رسالہ نکالنا شروع کیا۔ رسالے کی زبردست مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اُنھوں نے 'نئے ہندوستان' کے نام سے ایک روزانہ اخبار بھی جاری کر دیا۔

اپنے ہفتہ وار رسالے اور روزانہ اخبار میں لکھتے ہوئے وہ دیس میں 'اپنا راج' کی حمایت میں عوام کی رائے کو اُبھاتی تھیں۔ اُس کے ساتھ ہی وہ ہندوستانی اخبار نویسوں کو یہ بھی سکھاتی تھیں کہ اپنے اداریوں میں وہ برطانیہ اور ہندوستان کے انگریز حاکموں کی کارروائیوں کی کڑی مذمّت کس طرح کریں کہ خود قانون کی زد میں نہ آئیں۔ خاص طور پر اُنھوں نے سخت اور زوردار تنقید کرنے کا وہ طریقہ سکھایا جس کی بنیاد کھلی حقیقتوں پر ہو نہ کہ بے بنیاد باتوں پر۔

'اپنے راج' کے لیے احتجاج کو تیز تر کرنے کا مسز بیسینٹ کا نعرہ جب زور پکڑ رہا تھا تو اچانک اور امید کے خلاف 1914 کی پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں جرمنی اور اُسے کے ساتھیوں کے خلاف' برطانیہ اور فرانس صف آرا ہو گئے۔ مظلوم عوام کے احتجاج کو منظّم کرنے کا بہت تجربہ رکھنے والے اور چالوں سے واقف ایک رہنما کے لیے جو مخالف کی کمزوریوں سے پورا فائدہ اُٹھانا بھی جانتا ہو، یہ اتفاق ایک نعمت بن کر سامنے آیا۔ کیوں کہ برطانیہ کو اس لڑائی میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی مدد کی سخت ضرورت تھی۔

اس کے بعد دس سال تک ہندوستان کے سیاسی منظر پر مسز بیسینٹ چھائی رہیں۔ اور دو بڑے مقصد حاصل کرنے میں لگی رہیں۔ ایک ہندوستان کے لیے ہوم رول اور دوسرے اپنا دستور خود بنانے کے لیے ہندوستان کا حق۔

مسز بیسینٹ نے سب سے پہلے انڈین نیشنل کانگریس کے دو حلقوں کو مل کر کام کرنے کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی۔ ایک گروپ سوراجیوں کا تھا جس کے رہنما بال گنگا دھر تلک تھے اور دوسرا گروپ لبرل (نرم دل) لوگوں کا تھا جس کے رہنما گوپال کرشن گوکھلے تھے۔ سوراجی یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کو آزاد کرنے پر برطانیہ کو مجبور کر دینے کے لیے زوردار احتجاج کی ایک تحریک چلائی جائے۔ نرم دل والے یہ چاہتے تھے کہ احتجاج کے بجائے

بات چیت کے ذریعے یہ مقصد حاصل کیا جائے۔

بہت احتیاط کے ساتھ کام کرتے ہوئے مسز بیسینٹ نے ان دو ٹولیوں کو 'آل انڈیا ہوم رول لیگ' کے ملے جلے پلیٹ فارم پر جمع کر لیا۔ یہ لیگ مسز بیسینٹ نے ہی قائم کی تھی۔ 1915 میں مسز بیسینٹ نے 'لیگ' کے منشا کی وضاحت اس عنوان سے کی کہ "ہندوستان کیا چاہتا ہے؟"

یہ کہ:

- ہندوستانی، ہندوستان میں اُسی طرح آزاد ہوں جیسے انگلستان میں انگریز آزاد ہیں۔
- آزادی کے ساتھ اُن کے چنے ہوئے اپنے لوگ ہی حکومت کا کام چلائیں۔
- اپنی سرحدوں کے اندر وہ ایک خود مختار قوم ہوں۔
- برطانیہ اور ہندوستان ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلیں، لیکن ہندوستان اتنا ہی آزاد ہو جتنا اُس کا حق ہے۔

ان مانگوں کو منظور کرانے کے لیے دباؤ ڈالنے کا موقعہ جلد ہی مل گیا۔ برطانیہ کی حکومت نے اپنی ڈومینینوں اور نو آبادیات سے اپیل کی "جنگ جیتنے میں ہماری مدد کیجیے۔" اپیل میں یہ بھی کہا گیا کہ جنگ کے کامیابی کے ساتھ ختم ہونے کے بعد "برطانیہ اور اُس کی ڈومینینوں کے درمیان" ایک "نیا سمجھوتہ (نیو ڈیل)" ہوگا۔

گورے لوگوں کی ڈومینینوں اور ہندوستان کے ساتھ (اور ایشیا اور افریقہ کی دوسری نو آبادیات کے ساتھ بھی) برتاؤ میں برطانیہ کی اس کھلی جانب داری نے مسز بیسینٹ کو قائل کر دیا کہ ہندوستان کے لیے 'ہوم رول' کی مانگ زوردار طریقے سے کرنا اب ضروری ہے۔ جس بات نے اُن کے اِس فیصلے کو اور مضبوط کیا وہ یہ تھی کہ ہندوستان میں موجود انگریز، خواہ وہ سرکاری افسر ہوں یا تاجر، مذاق اُڑاتے ہوئے یہ کہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ تو ابھی کئی نسلوں تک اِس لایق نہیں ہوں گے کہ ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ ملے۔

مسز بیسینٹ جیسی ذہین رہنما نے ہندوستان کے لیے ہوم رول حاصل کرنے کی جدوجہد کو ایک نئی سمجھداری دی۔ اس لڑائی کی حکمت عملی اُنھوں نے یہ طے کی کہ "جب لوہا گرم ہو، تو اُس پر چوٹ مارو" اور چوٹ مار مار کر لوہے کو گرم کرو۔"

ہوم رول لیگ

انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس دسمبر 1915 میں بمبئی میں ہوا۔ مسز بیسینٹ نے اس اجلاس کی ایک خاص نشست بلا کر اُس میں 'ہوم رول لیگ' شروع کرنے کا اپنا منصوبہ پیش کیا۔ عملی کام 1916 میں شروع ہوا۔ مسز بیسینٹ کی شروع سے ہی یہ کوشش رہی کہ مختلف سیاسی جتھوں کو نرم دل والے، شدّت پسند، فرقہ پرست، تنگ نظر اور دوسرے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ساتھ ملا کر کام کریں تاکہ متحدہ قومی مطالبہ پیش کیا جا سکے۔

ان کوششوں کو تقویت پہنچانے کے لیے اینی بیسینٹ نے اپنے روزانہ اخبار "نیو انڈیا" میں کڑے وار کرنے والے مضامین روزانہ لکھنے شروع کیے۔ "ہندوستان کے برطانوی ایمپائر کے لیے کارآمد ہونے کی شرط، ہندوستان کی آزادی ہے۔" "جنگ کے لیے کوششوں میں برطانیہ کی مدد کرنے لیے ہندوستان کی شرط، ہندوستان کی آزادی ہے۔" وہ گرجتی رہیں۔
اس کے علاوہ کام کرنے کی بے مثال قوّت کا مظاہرہ کرتے ہوئے، جو نہ تھکنا جانتی تھی نہ آرام کرنا، مسز بیسینٹ جنگ کے فوراً بعد ہندوستان کو ہوم رول دیے جانے کے لیے ایک زبردست ہلچل پیدا کرنے والی جدوجہد چلاتی رہیں (جو آگ کی طرح ہر طرف پھیلتی چلی جا رہی تھی) "انگلستان کی پریشانی میں ہندوستان کے لیے کامیابی اور کامرانی چھپی ہے۔" اُس نعرے کو اُنھوں نے ہر طرف عام کر دیا۔
ہر محاذ پر ہلّہ بولنے کے فن کی تجربہ کار ماہر۔ مسز بیسینٹ نے اپنی تحریروں کے خلاف ہندوستان کے انگریز حاکموں کی انتقامی کارروائیوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ سیاسی کارروائیوں کو دبانے کے لیے حال ہی میں بنائے گئے جابرانہ قانون کے تحت اُن کے روزانہ اخبار سے بار بار ضمانت کے طور پر بھاری رقمیں طلب اور ضبط کی جانے لگیں تاکہ 'ہوم رول' تحریک کے حق میں آواز نہ اُٹھائی جا سکے۔

عدالت میں مقدمہ

اس کے علاوہ مسز بیسینٹ کے خلاف ایک مقدمہ بھی عدالت میں دائر کر دیا گیا۔ مسز بیسینٹ نے عدالت میں اپنے کاموں اور تحریروں کا خود دفاع کرتے ہوئے سفید لوگوں کی ڈومینین اور ہندوستان کے ساتھ برطانیہ کے سلوک میں دوغلی پالیسی کا پردہ فاش کیا۔ اس مقدمے نے پورے ہندوستان میں اور باہر بھی، ہوم رول تحریک کو بڑی شہرت دی۔ اور ملک کے کونے کونے میں بڑی تیزی کے ساتھ "ہوم رول لیگ" کی شاخیں قائم ہونے لگیں اور اس کے ممبروں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

ہندوستان کے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ نے لیگ کی زبردست مقبولیت کو دیکھتے ہوئے جون 1917 میں مسز بیسینٹ کو اُن کے گھر میں نظر بند رکھنے کے احکامات جاری کر دیے۔ لیکن، برطانوی پارلیمنٹ کے ایک اہم ممبر کے قول کے مطابق اس کارروائی نے ہوم رول کے لیے احتجاج کرنے والوں کی تعداد میں جیومیٹری کے تناسب (2:4 :16 :256....) سے اضافہ شروع کر دیا۔

مسز بیسینٹ کو اُن کے گھر میں نظر بند کر دیے جانے کے بعد کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر مانٹیگو، نے اپنی ڈائری میں لکھا" مجھے ہندوستانی دیومالا کا ایک قصہ خاص طور پر یاد آیا۔ بھگوان شو نے اپنی بیوی کو مار کر اُس کے اکیاون (51) ٹکڑے کر دیے تو اُنھیں پتہ چلا کہ اُن کی تو اکیاون بیویاں ہو گئیں۔ مسز بیسینٹ کو قید کر کے حکومت ہند کے ساتھ کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔"

مسز بیسینٹ کی اس گرفتاری نے بہت سے لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا کر دی۔ اس نے پُرانی نسل کے اُن رہنماؤں کو بھی ہلا کر رکھ دیا جو ہوم رول تحریک کے بارے میں عام طور پر برطانیہ کی پالیسی کی حمایت کیا کرتے تھے۔ اس گرفتاری کے بعد، سوراجیوں کے دَل کے ایک راہ نما موتی لال نہرو اور اُن کے بعد محمد علی جناح اور سی۔ پی۔ راماسوامی آئیر جو ایک کٹر انگریز پرست سیاست داں تھے، ہوم رول لیگ میں شامل ہو گئے۔

برطانوی حکومت کو بہت فکر ہوئی جب امریکہ میں برطانیہ کے بہت سے حامیوں نے

مسز بیسینٹ کی نظر بندی کے بعد اُن کے انسانی اور سیاسی حقوق کی پامالی پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا۔ اور خاص طور پر جب امریکہ کے صدر ووڈ رو ولسن نے ہندوستان کے ہوم رول کے مطالبے کو مان لینے کے لیے برطانیہ کی حکومت پر زور ڈالا۔

اسی دوران خود ہندوستان میں مسز بیسینٹ کی رہائی حاصل کرنے کے لیے حکومت کے کاموں کی خاموش مزاحمت کرنے کی ایک مہم کا منصوبہ بنایا جانے لگا۔ جولائی 1917 میں کانگریس اور مسلم لیگ کا ایک مشترک جلسہ بلایا گیا جس میں مسز بیسینٹ کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

ایک اور بات یہ ہوئی کہ مدراس ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج اور ممتاز قانون داں ایس۔ سبرامانیم آئیر نے احتجاج کے طور پر اپنا سر کا خطاب واپس کر دیا۔ اپنے قسم کی اس پہلی احتجاجی کارروائی نے برطانوی کابینہ کو چونکا دیا جو اب تک احتجاج کا کوئی اثر ہی نہیں لے رہی تھی۔ اب اُس کو اندازہ ہوا کہ مسز بیسینٹ کے خلاف جابرانہ کارروائی سے ہندوستان کے ہر طبقے کے لوگوں میں کتنی ناراضگی پھیل گئی ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے اُس نے فوری قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا۔

برطانوی کابینہ میں ہندوستان کے لیے سکریٹری آف سٹیٹ کے عہدے پر، اس غرض سے مسٹر مانٹیگو کا تقرر کیا گیا۔ مصالحت کا روّیہ اختیار کرتے ہوئے مسٹر مانٹیگو نے ہندوستان کی سیاسی حیثیت میں آئندہ ایک بڑی تبدیلی لانے کا فیصلہ کیا۔ اور یقین دلایا کہ راج کاج رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کو ہی سونپ دیا جائے گا۔

اپنے روّیے میں تبدیلی کا یقین دلانے کے لیے 16/ ستمبر 1917 کو مسز بیسینٹ کو رہا کر دیا گیا۔ ہر جگہ اُن کا زبردست استقبال ہوا۔ ایک دیکھنے والے نے لکھا کہ ''اس وقت وہ مادرِ ہند کی زندہ مثال بن گئی ہیں۔''

کانگریس کی صدر

دسمبر 1917 میں کلکتہ میں انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں، اسی جذبے کا

اظہار کرتے ہوئے، اکثر صوبائی کانگریس کمیٹیوں نے کانگریس کی صدارت کے لیے اُن کو ہی پسند کیا۔ اس طرح مسز بیسینٹ پہلی خاتون تھیں جنھیں کانگریس کی تاریخ میں سب سے اونچا عہدہ ملا۔ ہندوستان کے لوگوں کی طرف سے اپنی شکر گزاری کے اس انوکھے اظہار نے اُن کو بہت متاثر کیا۔ اُنھوں نے کھُل کر کہا۔ ''انگریزوں نے ہندوستان میں میری تذلیل کی لیکن ہندوستان کے لوگوں نے بڑے احترام کے ساتھ مجھے سر پہ بٹھایا۔'' اور یہ بھی کہ ''جب مجھے خاموش کر دیا گیا اور اپنی صفائی بھی پیش نہیں کرنے دی گئی تو ہندوستان کے لوگوں نے میرا دفاع کیا اور گھر میں قید رکھے جانے سے مجھے رہائی دلوائی۔''

انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں مسز بیسینٹ کے صدارتی خطبے نے پوری قوم کو، نوجوانوں کو بوڑھوں کو، سب ہی کو ہلا دیا۔

''پیدائش مغرب کی، لیکن روح مشرقی۔ انگلستان میں پرورش پاکر ہندوستان کو خوشی سے اپنا وطن قرار دینے والی، آپ مجھے برطانیہ اور ہندوستان کے ملاپ کا ایک نمونہ سمجھیے۔ دلوں کے ملاپ کا، اپنے خواہش سے نہ کہ زبردستی، اس لیے ایسا بندھن جو ٹوٹ نہ سکے۔ محبت کا اور ایک دوسرے کے کام آنے کا رشتہ ،دونوں قوموں کے لیے سود مند اور خدا کا بخشا ہوا۔

''میں آپ کے اس عطیّہ کو مادرِ وطن کی خدمت کا ذریعہ بناتی ہوں اور اپنے کاموں کے ذریعے اس کی پوجا کرنے کے لیے پھر سے اپنے آپ کو وقف کرتی ہوں۔ جو کچھ بھی میرے پاس ہے اور جو کچھ بھی میں ہوں وہ سب کچھ 'ماں' کے قدموں پر نچھاور کرتی ہوں۔ تب' محض زبان سے نہیں بلکہ اپنے کاموں کے ذریعہ ہم سب مل کر کہیں گے۔ ''وندے ماترم''

''ہندوستان کو آزاد دیکھنا، قوموں کے درمیان اُس کو سر بلند دیکھنا، اُس کے بیٹوں اور بیٹیوں کو ہر جگہ باعزّت دیکھنا، اپنے شاندار ماضی کا اہل ہوتے ہوئے اُس سے بھی شاندار مستقبل کی تعمیر میں مصروف دیکھنا، کیا یہ ایسا نہیں ہے کہ اِس کے لیے کچھ کیا جائے؟ کچھ جھیلا جائے؟ جیا جائے؟ اور مرنا پسند کیا جائے؟

''کیا دنیا میں کوئی اور ملک ایسا ہے جو اپنی روحانیت کے لیے اتنی اُلفت کا، اپنے ادب کے

لیے اتنی تعریف کا، اپنی بہادری کے لیے اتنے تشکر کا جذبہ اُبھارتا ہو جتنا قوموں کی یہ ماں اُبھارتی ہے؟ جس کی کوکھ سے جنم لینے والی نسلیں آج یورپ اور امریکہ میں دینا بھر کی رہنمائی کر رہی ہیں۔"

کیا کسی ملک کی اتنی تباہی ہوئی ہے جتنی ہمارے ہندوستان کی ہوئی ہے؟ کورکشیتر میں اُس کی تلوار ٹوٹ جانے کے بعد یورپ اور ایشیا کے لوگ اُس کی سرحدیں پار کر کر کے آئے اور اُس کے راجاؤں کو بے تاج کیا، اُس کے شہروں کو تاراج کیا۔ وہ فتح کرنے آئے اور یہاں رہ پڑے اور یہاں کی آبادی میں گھل مل گئے۔ آخر اِن مختلف لوگوں کو خدائی کارساز قوت نے ایک قوم بناڈالا۔ اُن کی پُرانی خوبیوں میں حملہ آوروں کی خوبیاں یکجا کر کے اور دھیرے دھیرے اُن برائیوں کا خاتمہ کرتے ہوئے جنھیں حملہ آور اپنے ساتھ لائے تھے۔

" قوموں میں سے ہندوستان ہی کو سولی پر چڑھنا پڑا۔ اَمر، نورانی، سداجوان۔ اور ہندوستان، جلد، فخر سے سر بلند، اپنے اوپر بھروسہ رکھنے والا، طاقت ور اور آزاد نظر آئے گا۔ ایشیا کا جگمگاتا شاہکار، دنیا کو روشنی بخشنے والا اور باعثِ رحمت۔"

انڈین نیشنل کانگریس کا کلکتہ والا اجلاس، ایک خاتون کو صدر بنانے کے علاوہ اور باتوں کی وجہ سے بھی یادگار اجلاس ہو گیا۔

اس اجلاس میں مسز بیسینٹ کی تحریک پر کانگریس نے اپنا پرچم طے کیا۔ لال، سفید اور ہرے رنگ کی، برابر چوڑائی کی تین پٹیاں، لمبائی کے رُخ اوپر نیچے رکھی ہوئی۔ 1930 تک کانگریس کا یہ ہی جھنڈا رہا۔ 1931 میں لال کے بجائے زعفرانی رنگ اختیار کیا گیا اور بیچ کی سفید پٹی پر چرخے کی شکل بڑھادی گئی۔

اس کے علاوہ مسز بیسینٹ نے یہ روایت بھی ڈالی کہ کانگریس کے سالانہ اجلاس کا صدر، پورے سال، یعنی اگلے اجلاس تک پوری تنظیم کی سربراہی کرتا رہے گا۔ اب تک کانگریس کا کام سال میں دو تین دن کے لیے اکھٹے ہو کر تقریریں کرنا ہی ہوتا تھا۔ لیکن مسز بیسینٹ کی موجودگی میں سال بھر تنظیم میں کام ہوتا رہا تاکہ 'اپنے راج' کے لیے ہندوستان کے مانگ کو جلد از جلد پورا کرنے کے لیے برطانیہ پر دباؤ ڈالا جاتا رہے۔

اختلاف

افسوس کہ 1919 اور اُس کے بعد کے واقعات کی وجہ سے انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ مسز بیسینٹ کے تعلقات رفتہ رفتہ پلٹا کھاتے چلے گئے۔ اس کی وجہ گاندھی جی کی رائے سے اُن کا اختلاف تھا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کو برطانوی حکومت سے منوانے کے لیے عوام سے سول نافرمانی کرانے کی تحریک شروع کی جائے۔ مسز بیسینٹ یہ نہیں چاہتی تھیں۔

مہاتما گاندھی کے اونچے آدرشوں کی، سادہ زندگی بسر کرنے اور نجی ضروریات کو کم سے کم کرنے اور تمام سیاسی تحریکوں میں عدم تشدّد اور سچّائی پر سختی سے قائم رہنے پر اُن کے اصرار کی مسز بیسینٹ کھل کر تعریف کرتی تھیں۔ لیکن، بُرے قانونوں کو بدلوانے کے لیے، خاموش مزاحمت کی حامی ہونے کے باوجود کسی بھی عام قانون کو توڑنے کے لیے مسز بیسینٹ اصولی طور پر راضی نہیں تھیں۔

اُن کا پکّا یقین تھا کہ عوامی اقدام کی کوئی بھی تحریک، تشدّد پر اُتر آنے والی قوتوں کو، آگے آنے کا موقع دے گی۔ اور ہندوستان کی قومی زندگی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ مسز بیسینٹ سیاسی اصلاح کے لیے قانونی طریقوں کی زبردست حامی تھیں۔ اس لیے وہ سول نافرمانی کرانے کی مکمل مخالفت کرتی تھیں۔ اُن کی پیشن گوئی تھی کہ اس کی وجہ سے تشدد آمیز ہنگامے اور خون خرابے کے واقعات ہوں گے۔ اور عوام قابو سے باہر ہو جائیں گے۔

ہندوستان کی سیاسی جدوجہد ایک دوراہے پر تھی۔ لوگوں کی بڑی تعداد نے آزادی حاصل کرنے کے لیے مہاتما گاندھی کی رہنمائی کو پسند کیا اور عوام کے سوِل نافرمانی کرنے کے پروگرام کی زوردار تائید کی۔ اسی لیے عوام پر سے مسز بیسینٹ کا اثر تیزی سے کم ہوتا چلا گیا۔

مسز بیسینٹ نے سیاسی منظر سے بالکل ہٹ جانے کے بجائے، ہندوستان کو ایک ڈومینین بنائے جانے کی پرانی مانگ کو برطانوی حکومت سے تسلیم کرانے کی پھر کوشش کی۔

1921 میں مانٹیگو چیمسفورڈ کی دستوری اصلاحات کے سرکاری طور پر شایع ہو جانے کے بعد اُنھوں نے اہم سیاسی رہنماؤں کا ایک قومی اجتماع بلایا۔ اُنھوں نے رہنماؤں سے درخواست کی کہ وہ برطانوی حکومت کے سامنے پیش کرنے کے لیے "ہندوستان کی ڈومینین" کے بل کے خاکے کا ایک مسوّدہ تیار کر دیں۔

بار بار کی تاخیر کے بعد "کامن ویلتھ آف انڈیا" کے لیے بل کا ایک مسودہ 1925 میں تیار ہوا۔ برطانوی پارلیمنٹ کی منظوری کے لیے اُس کی پیش کرانے کے واسطے مسز بیسینٹ خود انگلستان گئیں۔ اس معاملے میں پہل کرنے کے لیے اُنھوں نے لیبر پارٹی کے ایک ممبر کو راضی کر لیا۔ یہ معاملہ اگرچہ پیش ہو گیا لیکن سب سے اہم دوسری پیشی کے وقت پارلیمنٹ کے ممبران کی مناسب حمایت حاصل نہ کر پایا۔ سخت مایوسی کے عالم میں مسز بیسینٹ رفتہ رفتہ ہندوستان کے سیاسی منظر سے دور ہوتی چلی گئیں۔

ہندوستان کو آہستہ آہستہ ڈومینین کا درجہ دینے کے لیے ایک ایک قدم بڑھانے کی دستوری تجاویز پر غور کرنے کے لیے 1931,1932 میں برطانوی حکومت کی بلائی ہوئی برطانیہ اور ہندوستان کے نمائندوں کی گول میز کانفرنسوں کی ناکامی سے اور زیادہ مایوس ہو کر اُن کی صحت بھی خراب ہونی شروع ہو گئی۔

20 ستمبر 1933 کو اڈیار میں اپنے گھر پر مسز اینی بیسینٹ سکون کے ساتھ ابدی نیند سو گئیں۔

پاک روح

مسز ی بیسینٹ کے آخری الفاظ تھے، "اِس دور سے ہندوستان کو گزرنا ہی ہے۔ موجودہ رکاوٹوں کو پار کرنے کے بعد ہی وہ اپنی اصلی حالت میں آسکے گا۔ میرا کام ختم ہوا اب دوسرے اسے پورا کریں گے۔"

اس کام کی تکمیل چودہ سال بعد 15 اگست 1947 کو ہوئی جب ہندوستان آزاد ہوا۔

آزادی کے لیے ہندوستان کی سیاسی جدّوجہد کے خاص دھارے سے الگ ہو جانے کے

باوجود تمام ہی رہنماؤں نے اینی بیسینٹ کو فوری خراجِ عقیدت پیش کیا۔

ہندوستان میں آزادی کا شعور پھر سے پیدا کرنے میں اینی بیسینٹ کی کوششوں کے عام طور پر سراہے جانے کی ابتدا کرتے ہوئے جواہر لال نہرو نے کہا، "اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد میں اُن کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہی ایک شخص تھیں جنھوں نے ہمارے اپنے ورثہ کی طرف ہمارا دھیان دلایا اور اُس پر ہمیں فخر کرنا سکھایا۔

ہندوستان کو اپنی روح کو دریافت کرنے کے قابل بنانے کے لیے اُنھوں نے جو کچھ کیا اُس کے لیے بہت بڑے احسان کا قرض ہندوستان پر واجب ہے۔"

اینی بیسینٹ سے 1901 میں اپنی پہلی ملاقات کو یاد کرتے ہوئے نہرو نے کہا، "میری زندگی کے اہم واقعات میں وہ دن بھی شامل ہے جب میں پہلی بار اُن سے ملا تھا۔ میں 12 سال کا تھا۔ اُن کی شخصیت، اُن کے دلیرانہ کارناموں کی داستانوں اور اُن کے زورِ بیان سے میں ششدر رہ گیا۔ ایک چھوٹے بچّے کی گرویدگی (شدید لگاؤ) کے ساتھ میں اُنھیں تکتا رہا اور اُن کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔"

مناسب ہوگا کہ ہوم رول کی تحریک کے دوران مسز بیسینٹ کے بہت قریب رہ کر کام کرنے والے سی راجگوپال آچاریہ نے، ماہرانہ اختصار کے ساتھ، نئے ہندستان کے بنانے والوں میں سے ایک کی حیثیت سے اینی بیسینٹ کے رول کا جو جامع بیان دیا ہے، اس مضمون کے آخر میں اُسے پیش کر دیا جائے۔

"جن لوگوں نے ہندوستان کو ایک شکل دینے کے لیے ٹھوس کام کیے ہیں، اُن بلند شخصیتوں میں مسز بیسینٹ شامل ہیں۔ اُنھوں نے ہندوستان کے تمدّن اور مذہب کی عظمت کو پہچاننے میں نوجوان کی مدد کی۔ اُنھوں نے ہندوستان میں ہمیشہ نوجوانوں کی ہمّت افزائی کی اور کبھی اس وجہ سے دل چھوٹا نہ کرنے دیا کہ اُن کے بنائے ہوئے منصوبے بہت بڑھیا نہ تھے۔"

بھکائی جی کاما

دیپا اگروال
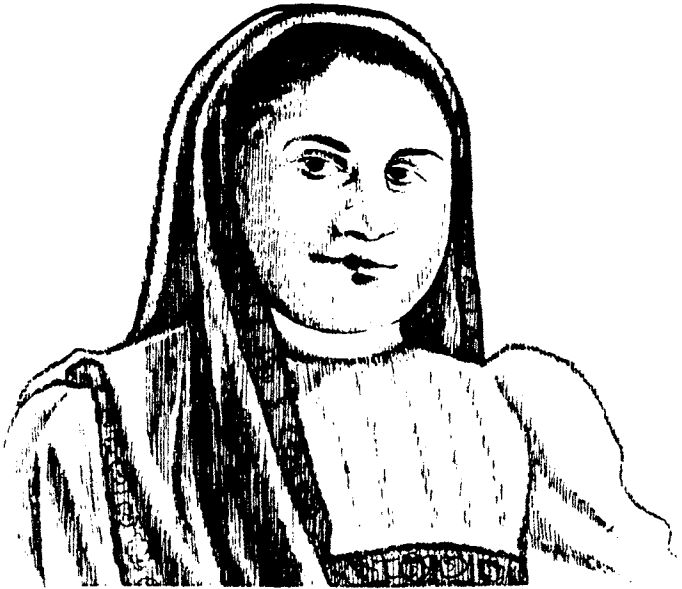
''میڈم بھیکا جی کاما ہندوستانی عورتوں کے انقلابی جذبے کا جیتا جاگتا نمونہ تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ اپنی مرضی سے ملک سے باہر رہ کر گزارا۔ اس زمانے میں انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی حمایت میں یوروپ کے لوگوں کی رائے تیار کرنے کی کوشش کی اور ہونہار ہندوستانی انقلابیوں کی ایک ٹولی کی مدد اور ہمت افزائی جاری رکھی۔ انھوں نے ہمارے قومی پرچم کی نمائش جس جرأت مندی کے ساتھ کی اور اس کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے جو پہل کی اس کے لیے ہم انھیں خاص طور پر یاد رکھتے ہیں۔ انھوں نے جس ترنگے کو لہرایا تھا، آزادی کے لیے ہماری تحریک نے کچھ تبدیلیاں کر کے اسی کو اپنا پرچم بنالیا۔ ہندوستان کے لوگوں اور خاص کر نوجوانوں کو ان کی زندگی سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے''۔

اندرا گاندھی

بھکائی جی کاما

جب ہم اپنے قومی پرچم کو لہراتا دیکھتے ہیں تو ہم اپنے اندر حب الوطنی کا ایک جوش سا اور ایک قوم کی حیثیت سے اپنے آپ پر فخر سا محسوس کرتے ہیں۔

اس کے پیچھے جو تاریخ ہے کیا ہمیں کبھی اس کا بھی خیال آتا ہے؟

ہم سب جانتے ہیں کہ ہندوستان 1947 میں ایک آزاد ملک بنا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک لمبی اور کڑی جدوجہد کے بعد ہمیں آزادی اور اس جھنڈے کو لہرانے کا حق ملا جو ہماری قومیت کا سب سے اہم نشان ہے۔ لیکن ہم میں سے کتنے اس دلیر خاتون کے بارے میں کچھ جانتے ہیں جس نے پہل کر کے اس پرچم کو اول بار لہرایا تھا؟

اس خاتون کا نام 'بھکائی جی کاما' تھا۔ اور 1907 وہ سال تھا جب ہمارا قومی پرچم — اب سے تھوڑی بدلی شکل میں — لہرایا گیا تھا۔ مقام تھا اسٹٹ گارٹ، جرمنی میں 'جہاں بین الاقوامی سوشلسٹ کانگریس کا ایک اجلاس ہو رہا تھا۔

آزادی کی جدوجہد کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے ابھی ایک لمبا راستہ طے کرنا تھا۔ پرچم لہرا دینے کے اس دلیرانہ کام نے نہ صرف دنیا کے ملکوں کی توجہ، ایک محکوم ملک کی حیثیت سے ہندوستان کی طرف موڑ دی بلکہ آزادی کی لڑائی لڑنے والوں کو ایک ایسا نشان بھی دے دیا جس کے نیچے اکٹھے ہو کر وہ لڑ سکیں۔ جیسا کہ گاندھی جی نے بعد میں کہا، "ہر قوم کے لیے ایک پرچم ضروری ہے۔ لاکھوں انسانوں نے اس کے لیے جانیں دی ہیں کیوں کہ پرچم ایک تصور کو ظاہر کرتا ہے ہم ہندوستانیوں کے لیے بھی یہ ضروری ہوگا — ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں، پارسیوں اور ان سب لوگوں کے لیے جو ہندوستان

کو اپنا گھر سمجھتے ہیں' کہ وہ ایک ہی پرچم کو اپنا مان لیں، اسی کے لیے جیئیں اور مریں''۔ پنڈت نہرو نے کہا، ''مجھے یاد ہے اور بہت سوں کو یاد ہوگا کہ جب جب یہ ترنگا جھنڈا نظر آتا تو ہم کیسا فخر اور جوش سا محسوس کرتے۔ ہماری رگوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگتی اور بعض مرتبہ جب ہم نڈھال اور مایوس ہوتے تو اس پرچم کا نظارا ہم میں آگے بڑھنے کی، ہمت پیدا کردیتا''۔

'میڈم کاما' جن کو اکثر ''ہندوستان کے انقلاب کی ماں'' کہا جاتا تھا24 ستمبر 1861 کو بمبئی میں ایک مالدار پارسی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ 'سراب جی، فرام جی پٹیل، ان کے والد اور 'جیجی بائی' ان کی ماں تھیں۔ ان کے والد بہت ہی مالدار تھے کیوں کہ انھوں نے اپنے ہر بیٹے کے لیے تیرہ، تیرہ لاکھ روپے چھوڑے اور اپنی آٹھوں بیٹیوں میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک لاکھ روپے وقف کیے۔

اس زمانے میں کچھ ہی لڑکیاں باقاعدہ تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ دراصل ان میں سے زیادہ تر لکھنا پڑھنا کم ہی سیکھتی تھیں۔ لیکن پارسی ترقی پسند لوگ تھے۔ اس لیے بھکائی جی کو جو اعلا سے اعلا تعلیم ممکن تھی وہ ملی۔ انھوں نے بمبئی کے الیکزینڈرا گرلس اسکول، میں پڑھا۔ اور بہت سی ہندوستانی اور غیر ملکی زبانیں بھی فرفر بولنی سیکھ لیں۔

ہندوستانی تاریخ کا یہ ایک ہنگامی دور تھا۔ 1857 کی بغاوت کو کچلنے میں اگرچہ انگریز کامیاب ہوگئے تھے لیکن ہندوستان کی آزادی کا سوال اب بھی باقی اور زندہ تھا۔ آزادی کا مفہوم وسیع اور گہرا ہوتا جارہا تھا۔ اور اس کے لیے الگ الگ راستے سوچے جارہے تھے۔ جیسے جیسے برطانوی راج کی سختیاں بڑھتی گئیں، ہندوستان کے لوگوں کی بے اطمینانی بھی بڑھنے لگی۔ آزادی کے لیے لڑنے والوں کا ایک نیا طبقہ میدان میں اتر آیا۔ یہ درمیانی طبقے کے تعلیم یافتہ لوگ تھے جن پر مغربی خیالات کا اثر تھا۔

سوامی وویکانند اور سوامی دیانند جیسے مذہب کی اصلاح کرنے والوں نے لوگوں کے روحانی جذبے کو جگانے کی کوشش شروع کی اور ہندوستان کی قدیم وراثت پر فخر کرنے کے جذبے کو پھر سے ابھارا۔ مہاراشٹر میں 'تلک' اور بنگال میں اوروندو گھوش کی کوششوں سے انقلابی

رجحان پھر سے ابھرنے لگا۔ قوم پرست خفیہ جماعتیں بننے لگیں۔ اور انگریزوں کی زبردستیوں کے خلاف احتجاج کے تشدد بھرے واقعات ہونے لگے۔

بھکائی جی سیاسی معاملات میں گہری دل چسپی لیتی تھیں۔ یہ بات اس زمانے میں جب عورتیں صرف گھرداری میں ہی دل چسپی لیتی تھیں، بڑی عجیب سی لگتی تھی۔ چاروں طرف کے دل ہلا دینے والے واقعات ان پر گہرا اثر ڈالتے تھے۔

1885 ان کے لیے اہم سال تھا۔ اس سال ان کی شادی 'رستم جی کاما' سے ہوئی جو ایک بیرسٹر تھے اور بمبئی کے سب سے زیادہ جانے پہچانے خاندانوں میں سے ایک کے فرد تھے۔ وہ ایک مشہور پارسی مصلح (اصلاح چاہنے والے) اور عالم، کے۔ آر۔ کاما کے بیٹے تھے۔

کانگریس کا جنم

1885 میں ہی 'انڈین نیشنل کانگریس' کا پہلا اجلاس ہوا۔ 'بھکائی جی' اس واقعے سے متاثر اور بہت ہی خوش تھیں۔ وہ اپنے ملک کو غیر ملکی جوئے سے آزاد دیکھنے کی مشتاق تھیں۔ ان کی دور بین نظر انھیں دکھا رہی تھی کہ ملک کی آزادی کے لیے مردوں کے ساتھ کام کرنے سے عورتوں کو اپنی بے بسی سے نجات حاصل کرنے کا ایک موقع ملے گا۔

سماج کے سب سے زیادہ مالدار طبقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بھکائی جی اپنا وقت سماجی تفریحات میں بھی گزار سکتی تھیں لیکن انھوں نے اپنے آپ کو پبلک کے کاموں میں لگائے رکھا۔ 1896 میں بمبئی میں پلیگ (طاعون) کی وبا پھیلنے کے زمانے میں انھوں نے اپنی سماجی خدمت کی زندگی کی شروعات کی۔ اس زمانے میں کسی مالدار خاتون کو پبلک اسپتال میں مریضوں کی دیکھ بھال کرتے کسی نے سنا بھی نہیں تھا۔ لیکن بھکائی جی باہمت تھیں۔ اُنھوں نے رواج اور دستور پر اُن باتوں کو ترجیح دی جنھیں وہ ٹھیک سمجھتی تھیں۔ پلیگ کے دوران ان کے تجربات اور انگریزوں کی طرف سے لگائی ہوئی ان پابندیوں نے جو صرف سخت ہی نہیں تھیں، بلکہ ان میں عوام کے لیے ہمدردی بھی نہیں تھی، ان چیزوں نے ملک کی آزادی کے

لیے ان کے تہیے کو اور تقویت بخشی۔ 'بومبے کرانیکل' کے لیے انھوں نے فیروز شاہ مہتہ کے ساتھ بھی کام کیا۔ اخبار نویسی کا یہ تجربہ بعد میں ان کے بہت کام آیا۔

بھکائی جی کے سیاسی خیالات سے ان کے شوہر اتفاق نہیں کرتے تھے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی یہ مانتے تھے کہ برطانوی راج ہندوستان کو فائدہ پہنچانے والا ہے۔ اس بات پر اکثر ان میں شدید اختلاف بھی ہو جاتا تھا۔ آخر انھوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ملک کی بھلائی سے ان کی وفاداری اتنی گہری تھی کہ اپنی شادی شدہ زندگی کو بچانے کے لیے بھی وہ اس کو نہ چھوڑ سکیں۔

1902 میں بھکائی جی اپنے علاج کی غرض سے لندن گئیں۔ یہاں ان کی زندگی کا ایک اہم دور شروع ہوا۔ ان کی ملاقات ہندوستان کے عظیم مرد بزرگ، 'دادا بھائی نورو جی' سے ہوئی۔ جن کے ساتھ انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ ان عظیم آدمیوں میں سے تھے جنھوں نے بھکائی جی کو متاثر کیا۔ اس کے باوجود وہ ان کے نرم رویئے اور بیچ بیچ کا راستہ اختیار کرنے کے خیالات سے کچھ ہٹ کر زیادہ گرم اور انقلابی خیالات کی طرف راغب ہوئیں۔ نورو جی کے ذریعے ان کی ملاقات سردار سنگھ رانا اور بعد میں شیام جی کرشن ورما سے ہوئی۔

یکم جولائی 1905 کو ایک اہم واقعہ ہوا۔ وہ تھا انڈیا ہاؤس کا افتتاح۔ بعد میں لندن میں اسے ہندوستان کی انقلابی تحریک کا صدر دفتر ہونا تھا۔ شیام جی کرشن ورما، سردار سنگھ رانا، ویر ساورکر، لالہ ہردیال، بریندر ناتھ چٹوپادھیائے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ میڈم کاما نے بھی اس کے کاموں میں عملی حصہ لیا۔ وہ بہت اچھی منتظم تھیں اور بہت سے انقلابی نوجوانوں کی ہمت بندھائے رکھنے کا ذریعہ بنیں۔ اگرچہ انڈیا ہاؤس کے بانی شیام جی تھے لیکن کسی اختلاف کے بغیر سب کے رہنما ساورکر ہی تھے۔ وہ ایک ذہین، نڈر اور وفادار محب وطن تھے اور نظریاتی بحث مباحثوں کے بجائے ٹھوس کام کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ میڈم کاما بھی ہندوستان کی لڑائی کے واسطے زیادہ سے زیادہ مضبوط اور بااثر طریقے اپنانا چاہتی تھیں۔ پہلے وہ

اٹلی کے انقلاب 'مازنی' اور 'گیریبالڈی' سے متاثر تھیں بعد میں گورکی اور لینن جیسے روسی انقلابیوں سے ان کو رہنمائی اور حوصلہ ملا۔

یہ ان کی مصروفیات کا زمانہ تھا۔ لندن کے ہائیڈ پارک میں وہ دھواں دھار تقریریں کرتیں اور ہندوستان میں انگریزوں کے مظالم کی شدید مذمت کرتیں۔ "انڈین سوشولوجسٹ" رسالے میں، جسے 1905 میں شیام جی نے نکالا تھا پابندی کے ساتھ مضامین لکھتیں۔ ساورکر کی کتاب 'ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ' کے فرانسیسی میں ترجمے میں بھی انھوں نے مدد کی۔ بہر حال اس پورے عرصے میں وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے ہنگامہ مچائے رہیں۔

ہرا، پیلا اور لال

اگست 1907 میں انھوں نے اپنی عملی زندگی کا سب سے زیادہ اہم کارنامہ انجام دیا۔ قومی پرچم لہرایا۔ سردار سنگھ رانا کے ساتھ وہ اسٹٹگارٹ (جرمنی) میں ہونے والی انٹر نیشنل سوشلسٹ کانگریس میں شامل ہوئیں۔ یورپ، ایشیا، امریکہ اور افریقہ کے پچیس ملکوں کے نمائندوں کے سامنے انھوں نے ہندوستان کو آزادی دلانے کی کوششوں میں مدد کے لیے بہت جوشیلی تقریر کی اور تقریر کے خاتمے پر نہایت ڈرامائی انداز میں ایک پرچم لہرادیا۔ ہرے، پیلے اور لال رنگوں والا یہ ترنگا پرچم تھا جس کی بیچ کی پٹی پر 'وندے ماترم' لکھا تھا۔

اس واقعے کا بہت اثر ہوا اور جرمن زبان کے اخبار دلیپز گر زیٹنگ' اور دوسرے اخباروں میں اس کی خبر شائع ہوئی۔ بعد میں محبِ وطن انقلابیوں کے دوسرے ریکارڈ کے ساتھ اس جھنڈے کو بھی 'اندو لال یاجنک' چوری چھپے ہندوستان لے آئے اور اب وہ پونا میں 'کیسری' اور 'مرہٹہ' کے لائبریری ہال میں رکھا ہوا ہے۔

اس پرچم کو میڈم کاما اور ساورکر نے ساتھ ساتھ تیار کیا تھا۔ ہرا رنگ مسلمانوں کے لیے متبرک تھا۔ سنہرا یا پیلا، بدھوں اور سکھوں دونوں کے لیے متبرک تھا اور لال ہندوؤں کے لیے۔ اس میں آٹھ ستارے بھی دکھائے گئے تھے جو ہندوستان کے آٹھ صوبوں کو ظاہر

کرتے تھے اور بڑی بڑی ان قومیتوں کی علامتیں تھیں جو سب ہندوستان میں مل جل کر رہتی تھیں۔

انٹرنیشنل سوشلسٹ کانفرنس کے بعد میڈم کاما نے یو۔ایس۔اے کا بہت کامیاب دورہ کیا۔ وہاں انھوں نے بہت سے جلسوں میں تقریریں کیں جس میں انھوں نے بتایا کہ انگریزوں نے کس طرح ہندوستان کو دبا کر رکھا ہوا ہے۔ اگرچہ وہ کوئی بہت زوردار مقرر نہیں تھیں لیکن ان کے خلوص اور جوش نے سب کو بہت متاثر کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ خاموش مزاحمت کا تصور جسے گاندھی جی بہت کامیابی کے ساتھ کام میں لائے، پہلے میڈم کاما ہی نے پیش کیا تھا۔ ایک اخباری نامہ نگار کے یہ پوچھنے پر کہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکالا کس طرح جائے گا؟ انھوں نے کہا تھا "خاموش مزاحمت کے ذریعے۔ ہم امن پسند لوگ ہیں، اور نہتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں بھی تو اٹھ کر لڑ نہیں سکتے۔ ہم اپنے لوگوں کو کارگر مزاحمت کے لیے تیار کر رہے ہیں، بس ضرورت اتحاد اور تنظیم کی ہے"۔

اسی سال 'والڈروف کے اسٹوریا ہوٹل' میں انھوں نے کہا۔ "ہم پر امن ہیں، ہم خونی انقلاب نہیں چاہتے لیکن ہم لوگوں کو اپنے حق حاصل کر لینا اور زور زبردستی کی حکومت کو اکھاڑ کر پھینک دینا ضرور سکھانا چاہتے ہیں"۔

بعد میں یقیناً ان کے خیالات بدلے اور وہ روسی طریقوں کی وکالت کرنے لگیں۔

ان کے اس دورے کا اخباروں میں بہت چرچا رہا اگرچہ وہ خود سنسنی خیز شہرت کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا "ہندوستان کے لوگوں کا ایک تمدن ہے۔ غریب سے غریب کسانوں نے بھی مہابھارت اور رامائن کی روحانیت بھری کہانیوں کو اپنے حافظوں میں محفوظ کر رکھا ہے"۔ وہ جہاں بھی جاتیں ان کا ترنگا پرچم ان کے ساتھ رہتا۔ امریکہ کے لوگوں کو ہندوستان کے سیاسی مسائل سے واقف کرانے اور ان کی نیک خواہشات حاصل کرنے میں وہ کامیاب رہیں۔

وہ یورپ لوٹ آئیں اور 1908 میں خاص طور پر بپن چندر پال سے ملنے پیرس گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بپن چندر کا بہت ہی احترام کرتی تھیں۔ بعد میں انھوں نے ایک مشہور تقریر کی جو چھپی اور ایک کتابچے "بندے ماترم" کی شکل میں تقسیم ہوئی۔ اس تقریر میں میڈم کاما نے کہا۔

"آزادی کے بغیر زندگی ہے کیا؟ اصولوں کے بغیر جینا کیسا؟ دوستو! آؤ ہم تمام رکاوٹوں، شبہوں اور خوف وہراس کو ایک طرف ڈال دیں۔ مازنی کے الفاظ میں میں آپ سے درخواست کرتی ہوں 'آیئے ہم ان لوگوں سے بحث کرنا بند کردیں جنھیں ہماری تمام دلیلیں زبانی یاد ہیں، پھر بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر ہمارے لوگ حقیر نظر آتے ہیں تو یہ ایک اور وجہ ہے کہ ہم ان کی حالت سدھارنے کے لیے تمام خطروں کے باوجود کوشش کیے جائیں۔ اپنی عزت کا مظاہرہ کرو ہندوستانیو! اور کام میں جٹ جاؤ۔ خاموش لیکن ٹھوس کام کرو۔' مٹھی بھر غیر ملکیوں، چند انگریزوں نے ہم سے جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے اگر ہم جو کروڑوں کی تعداد میں ہی ان کے اس چیلنج کو قبول کرلیں اور ان کے خلاف جنگ چھیڑ دیں؟ آزادی کی قیمت چکانی تو پڑے گی ہی۔ کس قوم کو قیمت دیے بغیر یہ ملی ہے؟ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے لوگ یہ جان گئے ہیں کہ آمریت (زور زبردستی) کو برداشت کرنا گناہ ہے۔ رکے بغیر لڑتے رہنا انھوں نے سیکھ لیا ہے۔ انھوں نے کیڑوں کی طرح مرنے کے بجائے نڈر ہوکر مرنا سیکھ لیا ہے۔ ہم جاگ گئے ہیں اور اپنے شاندار ملک کے نام پر ہم ان کا سامنا کرتے ہیں جو ہمیں دبا رہے ہیں۔

"ہمیں اپنا ملک واپس چاہیے۔ ہندوستان کو انگلستان کی کسی 'اوک' کی ضرورت نہیں ہے۔ خود ہمارے پاس نیک 'برگد کا پیڑ ہے اور خوبصورت کنول کے پھول ہیں۔ ہم برطانوی تہذیب کی نقل نہیں بننا چاہیے۔ ہم اپنی ہی تہذیب کو اختیار کریں گے جو زیادہ پرانی اور زیادہ شریفانہ ہے"۔

اس تقریر کے بعد انھوں نے پھر جھنڈا لہرایا۔ دراصل ان کا یہ دستور ہوگیا تھا کہ جہاں

بھی وہ تقریر کرتیں اپنے پیچھے کے دیوار یا پردے پر اس جھنڈے کو پھیلا کر لگوالیا کرتی تھیں۔

بنکم چندر کے گیت ''وندے ماترم'' کو انقلابیوں نے قومی دعا کے طور پر اپنا لیا تھا۔ وہ آپس میں اس کو سلام یا نعرے کے طور پر بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ 'میڈم کاما' ان الفاظ کو بہت اہمیت دیتی تھیں۔

نومبر 1908 میں وہ پھر لندن آئیں۔ وہ جلسوں میں شریک ہوتیں، مجمعوں کو خطاب کرتیں۔ 29، نومبر کو 'کیکسٹن ہال' 'ویسٹ منسٹر' میں سکھوں کے ایک بڑے گرو، گرو گوبند سنگھ کا جنم دن منانے کے لیے ایک تاریخی جلسہ ہوا۔ ساورکر نے ان کی تعریف کرتے ہوئے انھیں غیر ملکی قبضے کی مزاحمت کی ایک روشن مثال بتایا۔ سکھوں سے یگانگت دکھانے کی ایک نشانی کے طور پر سب نے پگڑیاں باندھیں۔ سکھوں کے جھنڈے اور ہندوستان کی قومی آزادی کے جھنڈے کو نمایاں طور پر لگایا گیا۔ قومی اتحاد اور مذہبی رواداری کی اس سے اچھی اور کیا مثال ہو سکتی تھی۔ میڈم کاما کی بڑی خوبیوں میں سے یہ بھی ایک تھی کہ وہ علاقائیت، مقامی فخر اور مذہبی کٹر پن سے بہت بلند تھیں۔

پیرس میں

اب پیرس ان کا صدر مقام ہو گیا۔ کیوں کہ یہ افواہیں گرم تھیں کہ برطانوی حکومت ان کو ملک بدر کرنے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ میڈم کاما بھی اب آزادی حاصل کرنے کے لیے تشدد آمیز طریقے استعمال کرنے کی سفارش کرنے لگی تھیں۔ وہ محسوس کرتی تھیں کہ ظلم اور زیادتیوں کو خاموشی سے برداشت کیے جانا ایک گناہ ہے۔ وہ کھل کر کہتی تھیں کہ ''آزادی کی جدوجہد معمولی نہیں، غیر معمولی اقدامات کی مانگ کرتی ہے''۔

میڈم کاما وہ خاتون تھیں جو محض باتوں پر نہیں بلکہ عملی اور ٹھوس کارروائی پر یقین رکھتی تھیں۔ انھوں نے ہتھیار چلانا اور بم بنانا سیکھنے میں 'گووند امین' جیسے نوجوان انقلابیوں

کو مدد دینی شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے انقلابی تحریریں تیار کرنا اور انھیں اکثر پانڈیچری کے راستے، جو فرانسیسیوں کے تحت تھا، چوری چھپے ہندوستان بھیجنا شروع کر دیا۔ وہ یورپ میں ابھنو بھارت سوسائٹی، کی بھی روح رواں تھیں۔

ستمبر 1909 میں میڈم کاما اور لالہ ہردیال نے جو ایک ذہین نوجوان انقلابی تھے، 'بندے ماترم' اخبار نکالنا شروع کیا۔ ایک ایسے اخبار کی فوری ضرورت تھی جو انقلابی تحریک کے خیالات کو زور شور کے ساتھ پیش کر سکے۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ اخبار نکالا گیا۔ یہ لوگ بپن چندر اور آروبندو گھوش کے کام کو جاری رکھنا چاہتے تھے جنھوں نے کلکتے سے 'بندے ماترم' اخبار نکالا تھا اور جسے برطانوی حکومت نے 1908 میں بند کرا دیا تھا۔

کچھ عرصے بعد میڈم کاما نے ہندوستان کی آزادی کا ترجمان ''تلوار'' بھی شائع کرنا شروع کیا۔ بریندر ناتھ چٹوپادھیائے اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ اخبار برلن میں چھپ کر بریندر ناتھ کے پاس لندن بھیجا جاتا تھا اور وہاں سے چوری چھپے ہندوستان بھیجا جاتا۔ اس طرح انقلابیوں کی مضبوط اور انتھک کی جانے والی کوششوں کی وجہ سے نو آبادیاتی حکومت کی وہ کوششیں ناکام رہیں جن سے وہ ہندوستان کی آزادی کی بڑھتی ہوئی تحریک کو دبا دینا چاہتے تھے۔ یہ دونوں اخبار ہندوستان میں انگریزی راج کے خلاف کھل کر لکھتے اور اس کا خاتمہ کر دینے کے لیے سخت ترین طریقوں کا پرچار کرتے۔

جدوجہد کی حمایت

ہندوستان کی آزادی سے متعلق کاموں میں میڈم کاما اپنے پاس سے کافی مالی امداد فراہم کیا کرتی تھیں ان کے والد نے اپنی وصیت میں ان کے لیے خاصی معقول رقم چھوڑی تھی اور علاج کے لیے جب وہ لندن آنے لگیں تو ان کی والدہ نے اپنے زیورات میں سے ڈھیر سارے زیور بھی انھیں دے دیے تھے۔ وہ بہت عیش و آرام کی زندگی گزار سکتی تھیں۔ انھوں نے اپنے آرام اور سکون کو تیاگ کر آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں اپنے مالی وسائل استعمال کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

جون 1909 میں ساورکر کے بھائی گنیش دامودر ساورکر، کو ایک اشتعال انگیز نظم لکھنے کے الزام میں کالے پانی کی سزا سنائی گئی۔ یہ مقدمہ "ناسک سازش کیس" کہلاتا تھا۔ اس سزا سے لندن میں رہنے والے ہندوستانی انقلابیوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے نتیجے میں سیاسی قتل کی دو وارداتیں بھی ہوئیں۔ جولائی 1909 میں 'مدن لال ڈھینگرہ' نے 'سر ولیم کرزن۔ وائلی' کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جو لندن میں انڈیا آفس کے سیاسی 'ایڈ۔ ڈی۔ کیمپ' تھے۔ ادھر ہندوستان میں 'اننت کنہیری' نے ناسک کے کلکٹر اور ضلع مجسٹریٹ 'اے۔ ایم۔ ٹی۔ جیکسن' کو ہلاک کر دیا۔ ساورکر پر ان واقعات کا الزام لگایا گیا۔ سردار سنگھ رانا اور شیام جی بھی 'ملزم' ٹھہرائے گئے۔

اس موقع پر بھی ہمیشہ وفادار رہنے والی میڈم کاما نے اپنے ساتھیوں کی پشت پناہی کی۔ یہاں تک کہ پیرس میں برطانوی کاؤنسل کے دفتر جا کر انھوں نے ایک دستخطی بیان میں سارا الزام اپنے سر لے لیا۔ اور بتایا کہ جیکسن کو مارنے کے لیے ریوالور انھوں نے ہی ہندوستان بھیجا تھا۔

لیکن مارچ 1910 میں ساورکر لندن میں گرفتار کر لیے گئے۔ تمام کوششوں کے باوجود انھیں ہندوستان واپس بھیجنے کا حکم دے دیا گیا۔ جب ان کا جہاز مارسلیز میں کھڑا تھا تو انھوں نے جہاز سے سمندر میں کود کر تیرتے ہوئے کنارے پہنچ جانے کی کوشش کی۔ بدقسمتی سے ایک فرانسیسی پولیس مین نے انھیں پکڑ لیا۔

ساورکر ایک سیاسی قیدی تھے اور بین الاقوامی قانون کے تحت ان کو پناہ لینے کا حق حاصل تھا۔ میڈم کاما نے اس ناانصافی کے خلاف لڑنے اور ساورکر کو رہا کرانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اگرچہ ان کی صحت ٹھیک نہیں تھی پھر بھی انھوں نے اس بارے میں عوام کی تائید حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی اور سوشلسٹ اخبارات میں اپنے اثر اور رسوخ کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ بڑھتی ہوئی عوامی ہلچل نے فرانس کی حکومت کو مجبور کیا کہ وہ اس معاملے کو 'ہاگ' کی بین الاقوامی عدالت کے سامنے رکھ دے۔ لیکن عدالت میں برطانیہ کا اثر

کام کر گیا۔ اور ساورکر کو رہا نہیں کیا گیا۔ پھر بھی میڈم کاما نے ہمت نہیں ہاری اور ساورکر کا مقدمہ لڑنے کے لیے مشہور وکیل 'بپٹستہ' کی خدمات حاصل کی۔ لیکن کچھ نہ بنا۔ ساورکر کو سزا ہوئی اور انڈمان بھیج دیا گیا۔

ساورکر کی گرفتاری اور سزا پانے سے انقلاب کے مقصد کو سخت دھکا لگا۔ میڈم کاما پر بھی کافی عرصے تک مایوسی اور کچھ بددلی چھائی رہی۔ ساورکر کو بچانے میں ان کا کافی روپیہ خرچ ہو گیا تھا۔ لیکن انھیں اس کا ملال نہیں تھا۔ آخر انھوں نے اپنے اوپر پھر قابو پایا اور لندن میں رہنے والے انقلابیوں میں پھر سے اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں کے آپسی اختلافات آزادی حاصل کرنے کے مقصد کو دور کرتے جا رہے تھے۔ وہ ساورکر اور اس کے بھائی گنیش کو انڈمان خط لکھتی رہتی تھیں اور ان کے گھر والوں کو پابندی سے روپیہ بھی بھیجتی رہتی تھیں۔

روسی اثر

اسی زمانے میں پیرس میں ان کی ملاقات روسی انقلابیوں سے ہو گئی۔ روس کے انقلاب اور اس میں لینن کے رول سے انھیں گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ خاص طور پر میخائیل پاولوف کے وہ زیادہ قریب رہیں۔ جب وہ ساورکر کے معاملے میں لوگوں کی امداد حاصل کرنے کی مہم چلا رہی ہوئی تھیں تو پاولوف ان کے ساتھ اکثر اخباروں کے دفتر جایا کرتے تھے۔ ہندوستان کے سارے انقلابیوں میں مسز کاما ہی تھیں جو روسیوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئیں۔ مشہور روسی مصنف 'میکسم گورکی' سے ان کی خط و کتابت رہی۔ انھوں نے گورکی کو نہ صرف 'بندے ماترم' کے کئی شمارے اور ساورکر کی ''ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ'' کی ایک جلد' بلکہ اپنا ایک فوٹو بھی بھیجا۔ 1921 میں انھیں ماسکو میں ہونے والی 'عورتوں کی بین الاقوامی کانفرنس' میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ اس کانفرنس میں شریک نہ ہو سکیں۔

'میڈم کاما' نہ صرف روسی انقلابیوں سے رابطہ رکھے ہوئے تھیں بلکہ آئرلینڈ اور مصر

والوں سے بھی ملتی تھیں۔ فرانس کے سوشلسٹوں میں بھی ان کے بہت سے دوست تھے۔ ترکی، مصر اور مراقش کی آزادی کی جدوجہد میں بھی وہ عملی حصہ لیتی تھیں۔ وہ صرف قوم پرست ہی نہیں بلکہ بین الاقوام پرست بھی تھیں۔ برطانیہ کی خفیہ پولیس کی رپورٹ کے مطابق ان کی سرگرمیوں کے لیے ہندوستانی قوم پرستی کا میدان کچھ وسیع نہیں تھا۔ ان کا لڑائی کا نعرہ تھا۔ ''مشرق، مشرقیوں کے لیے''۔

پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ اور فرانس مل کر لڑے تھے۔ اس لیے اس زمانے میں مسز کاما کو تین سال کے لیے، نظر بند بھی رہنا پڑا۔ فرانس کی حکومت اگرچہ ان کے ساتھ ہمدردی کا رویہ رکھتی تھی لیکن ان کی صحت جو ہمیشہ خراب ہی رہتی تھی اور زیادہ خراب ہو گئی۔ انھیں یہ بھی لکھ کر دینا پڑا کہ اس عرصے میں وہ اپنی انقلابی کارروائیوں سے باز رہیں گی۔

مسز کاما پیرس میں، تقریباً تیس سال رہیں۔ عالمی جنگ کے بعد ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی۔ لیکن اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ برابر کام کرتی رہیں اور اپنی زندگی میں اپنے وطن کو آزاد دیکھنے کی امید انھیں آخر دم تک رہی۔

چھہتر سال کی عمر میں، جب وہ اتنی بوڑھی ہو چکی تھیں کہ حکومت کو ان سے کوئی حقیقی خطرہ نہ رہا تب انھیں ہندوستان واپس آنے کی اجازت ملی لیکن یہ بھی، اس تحریر پر دستخط کرنے کے بعد جس میں لکھا تھا کہ ہندوستان واپس جاکر وہ نہ کسی جلسے میں شرکت کریں گی اور نہ تقریر کریں گی۔ ور اب تو وہ اس قابل بھی نہیں رہی تھیں کہ کچھ لکھ سکیں، چل سکیں یا کھڑی ہو سکیں۔ بہر طور چونتیس سال ملک بدر رہنے کے بعد وہ اپنے وطن کی سرزمین پر اتریں اور سیدھی پارسی اسپتال روانہ ہو گئیں۔

یہاں آٹھ مہینے ان کا علاج چلتا رہا۔ ان کے شوہر نے انھیں معاف نہیں کیا۔ ان کے بہت سے رشتہ داران سے کتراتے رہے۔ کچھ عزیز اور کچھ پرانے پارسی دوست ان سے ملنے ضرور آئے۔

آخر 16/اگست 1936 کو یہ دلیر خاتون دنیا سے سدھار گئیں۔

مسز کاما نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ جو سب سے زیادہ قابلِ غور بات ہے وہ مقصد کے لیے ان کی پوری یکسوئی ہے۔ ان کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا -- اپنے ملک کی آزادی کے لیے لڑنا -- ہر طرح کے واقعات اور ہلچل سے بھری اپنی پوری زندگی میں وہ اس منزل کی طرف بڑھتی رہیں۔

اپنی ملک بدری کے طویل عرصے میں مسز کاما مسلسل اور انتھک جدوجہد کرتی رہیں۔ مشکل سے مشکل اور کڑے سے کڑے وقت میں بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ غضب کی دور اندیش تھیں۔ عوام کی طرف سے عدم تعاون کا اور جیلوں کو بھر دینے کا خیال سب سے پہلے انھیں کو آیا تھا۔

31/ دسمبر 1929 کو انڈین نیشنل کانگریس کے لاہور کے اجلاس کے موقع پر ترنگا جھنڈا باقاعدہ لہرایا گیا۔ لیکن میڈم کاما 1907 میں اسے لہرا چکی تھیں۔

میڈم کاما کی نگاہوں میں آزاد ہندوستان کی تصویر ایک ریپبلک کی تھی جس کی عام زبان ہندی اور عام رسم الخط دیوناگری ہوگا۔ اگرچہ وہ سخت مذہبی تھیں اور ایک لمبا عرصہ ملک سے باہر گزارنے کے بعد بھی وہ اپنے اعتقادات پر مضبوطی سے قائم رہیں، لیکن نسل اور مذہب کا فرق ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ 'ایک قوم' ایک زبان اور ایک لوگ، کے تصور میں وہ پورا پورا یقین رکھتی تھیں۔ ان کا پسندیدہ کتبہ یا تحریری جملہ (موٹو) یہ تھا "ظلم کے خلاف لڑنا خدا کا حکم بجا لانا ہے"۔ ایک غیر ملکی جابر حکومت کے خلاف جدوجہد کرنا ان کے لیے ایک مقدس فریضہ، ایک جہاد تھا۔

میڈم کاما بے نیاز ہو جانے کی حد تک بہادر تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک نرم دل 'ماں' جیسی خاتون تھیں۔ نوجوان انقلابیوں کے ساتھ بالکل 'ماں' کی طرح ان کی مدد کرنے والی اور ان کا دل بڑھانے والی۔ ان کا دل بہت بڑا تھا۔ وہ حاسد بالکل نہیں تھیں۔ اور اکثر اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے آپسی جھگڑوں میں حَکَم (جس کا حکم سب مانیں) بنتی تھیں۔ بنیادی طور پر وہ زندگی کی اچھی چیزوں کی شوقین تھیں۔ جب وہ جوان تھیں تو ہمیشہ

عمدہ لباس پہنتی تھیں اور اچھے کھانے اور اچھی محبت سے لطف اٹھاتی تھیں۔ لیکن اپنے ملک کی آزادی کے لیے جدو جہد کی خاطر آرام اور آسائش کی اپنی زندگی کو تج کر وہ کرایے کے چھوٹے مکانوں میں رہتی رہیں۔ وہ محبت کرنے والی اور معاف کر دینے والی بھی تھیں۔ اگرچہ ان کے امیر بھائی نے اپنی وراثت کے حق سے انھیں محروم رکھا لیکن ان کی زندگی کے آخری دنوں میں پیرس میں میڈم کاما ہی نے ان کی تیمارداری اور دیکھ بھال بھی کی۔

وہ اپنے ساتھیوں کی ہمیشہ وفادار رہیں اور ساورکر کو کالے پانی کی سزا ہو جانے کے بعد اس کے خاندان کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ جیسا کہ اپنے بھائی 'نارائن راؤ' کو ساورکر نے اپنے خط میں لکھا "ہماری پیاری میڈم کاما کی پائیدار مثالی محبت کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی"۔

کسی ملک بدر شخص کی زندگی بہت سخت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے وطن سے دوری انھیں اکثر اداس کر دیتی تھی۔ اور اپنے گھر کی یاد انھیں بہت ستاتی تھی۔ سنا ہے ایک مرتبہ جب کسی نے انھیں ایک گلدستہ لا کر دیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انھیں بمبئی کا اپنا چمن یاد آگیا۔ یہ سب انھوں نے قربان کر دیا اپنے وطن کی آزادی کے لیے کام کرنے کی خاطر۔

آزادی کی تحریک میں انقلابیوں کے رول کو پورے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ چھپ کر کام کرتے رہنے کی وجہ سے انھوں نے بہت تھوڑے ریکارڈ چھوڑے ہیں۔ اس لیے ان کے انجام دیے ہوئے بہت سے کام اب لوگوں کو یاد بھی نہیں رہے۔

میڈم کاما ایک ہراول تھیں، بہت بڑی، لیکن لوگ ان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ 1961 میں ان کی پیدائش کی صدی کے موقع پر بمبئی میں ایک سڑک ان کے نام کر دی گئی۔ 1962 میں ان کے اعزاز میں ڈاک کا ایک ٹکٹ بھی جاری کیا گیا۔ دہلی میں ایک تجارتی کمپلیکس کو ان کا نام دے دیا گیا۔

جس چیز کی واقعی ضرورت ہے وہ ان کی قربانیوں، ان کے کاموں اور ان کی کامیابیوں سے لوگوں کو واقف کرنا ہے۔ اس لیے اور بھی کہ ان کے زمانے میں عورتوں کو آج سے زیادہ دبا کر رکھا جاتا تھا۔

سروجنی نائیڈو

سرلا جگ موہن

مادرِ ہند کی خدمت میں

"اُٹھ ماں اُٹھ' اپنے دُکھوں سے نئی زندگی لے کر'

اور آسمانوں کی ایک دُلہن کی طرح'

اپنی سدابہار کوکھ سے نئے جلووں کو جنم دے۔

تیرا مستقبل تجھے پکار رہا ہے' مختلف آوازوں سے'

ہلال جیسی عزتوں' شوکتوں اور عظیم کامرانیوں کو پورے چاند جیسا بنادینے کے لیے۔

جاگ' اے سوئی ہوئی ماں' اور لے تاج پہن

تو جو آزاد ماضی میں کبھی ملکہ جہاں تھی۔"

سروجنی نائیڈو

سروجنی نائیڈو

"تمھارے جاگ اُٹھنے کی مبارک گھڑی کو

سجادینے میں ہم مصروف ہیں

ہمارا انتظار ختم ہوا

لو! دِن نکل رہا ہے"

یہ سطریں ایک نظم کی ہیں جو سروجنی نائیڈو نے بھارت ماں کو خطاب کرتے ہوئے لکھی تھی۔ سروجنی نائیڈو ہندوستان کے ممتاز قومی رہنماؤں میں سے ایک تھیں جو اپنے ساتھیوں کے لیے طاقت کا سرچشمہ اور نوجوانوں میں لگن پیدا کر دینے والی ہستی تھیں۔

سروجنی 13/ فروری 1879 کو حیدر آباد میں پیدا ہوئیں۔ وہ اگھورے ناتھ چٹوپادھیائے اور براداسندری' کے آٹھ بچوں میں سب سے بڑی تھیں۔ اگھورے ناتھ ایک سائنس داں اور ماہر تعلیم تھے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ براداسندری بھی شعر کہتی تھیں۔ اپنے شاعر بھائی ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے کی طرح سروجنی کو بھی یہ جوہر اپنے والدین سے وِرثے میں مِلا تھا۔ اُن کے والد انھیں ریاضی (حساب) داں بنانا چاہتے تھے لیکن حساب کا سوال حل کرنے کے بجائے وہ نظم آسانی سے کہہ لیتی تھیں۔ انگریزی زبان میں اُن کی نظمیں اگھورے ناتھ کو اتنی اچھی لگیں کہ 1903 میں اِن نظموں کا ایک پتلا سا مجموعہ اُنھوں نے شائع کرادیا۔ جس کا نام رکھا "دو نظمیں" (ایس۔ چٹوپادھیائے کی)"

بارہ سال کی عمر میں سروجنی نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا اور پوری مدراس پر

پریزیڈنسی میں سب سے اوّل رہیں۔ بعد میں آگے تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیجا گیا۔ لندن میں اُنھوں نے کِنگز کالج میں پڑھا اُس کے بعد کیمبرج کے گرِٹن کالج میں داخل ہوئیں۔ لیکن اُنھوں نے پڑھائی لکھائی میں زیادہ دلچسپی لی نہیں۔ اور اُس ملک کی ٹھنڈی آب و ہوا بھی اُن کے لیے اچھی ثابت نہیں ہوئی۔

اُڑان

لیکن انگلستان میں دو سال کے قیام کے دوران اُن کے دوستوں اور اُس وقت کی اہم ادبی ہستیوں نے اُن کی شاعری کی بہت تعریف کی۔ اُن میں ایڈ منڈ گوس اور آرتھر سائمنس بھی تھے۔ جنھوں نو عمر سروجنی کو اپنی شاعری میں ہندوستانیت لانے کی ترغیب دی۔ وہ تقریباً اگلے بیس سال تک نظمیں لکھتی رہیں اور اِس عرصے میں اُن کی نظموں کے تین مجموعے شائع ہوئے۔ سروجنی کی نظموں کے پہلے مجموعے 'سنہری دہلیز' (1905) کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ اور ایک شاعرہ کی حیثیت سے اُن کی خوبیوں کو مانا اور اُن سے اُمیدیں باندھیں۔ انگلستان کے 'لنڈن ٹائمز' اور 'مانچیسٹر گارجین'' جیسے بڑے اخباروں میں اِس مجموعے پر تعریفی تبصرے شائع ہوئے اور ہندوستان میں تو اُنھیں ایک نیا اُبھرتا روشن ستارہ قرار دیا ہی گیا۔

'سُنہری دہلیز' کے بعد اُن کا دوسرا مجموعہ وقت کا پرندہ' 1912 میں شائع ہوا۔

وقت کے پرندے کو تو

بس 'تھوڑی دور ہی اُڑنا ہے۔

اور لو! وہ تو اُڑ چلا۔

یہ انداز سب کو بہت پسند آیا اور بہت دِنوں تک ادب کے رسیا اِس سے لطف اٹھاتے رہے۔ اُس کے بعد نظموں کا تیسرا مجموعہ ''شکستہ پر'' 1917 میں شائع ہوا۔ جس میں وہ یوں نغمہ طراز ہوئیں۔

دیکھو' دیکھو میں اُٹھتی ہوں' اپنی بہار سے ملنے

اور ستاروں کو ناپنے ' اپنے شکستہ پر سے

اُن میں اُٹھ کر ستاروں تک پہنچ جانے کا جذبہ ہمیشہ رہا۔ کئی سال بعد 1946 میں نئی دہلی میں ہونے والی 'ایشین ریلشنز کانفرنس' کو خطاب کرتے ہوئے اِنھیں جذبات کو اُنھوں نے دہرایا "ہم بڑھتے جاتے ہیں آگے .... اور آگے 'اونچے .... اور اونچے' یہاں تک کہ ستاروں تک جا پہنچیں۔ آیئے ہم ستاروں تک جا پہنچیں" اسی رَو میں وہ آگے کہتی ہیں۔ "ہم چاند کے لیے روتے نہیں ہیں' ہم آسمانوں سے اُسے توڑ لیتے ہیں اور ایشیائی آزادی کے تاج میں اُسے ٹانک لیتے ہیں" مایوس ہو کر بیٹھ جانا' اُن کا مزاج نہیں تھا۔ اُنھیں تو اپنی مطلوبہ منزل تک پہنچنے کے لیے بس آگے ہی بڑھنا تھا۔ اونچے ہی اُٹھنا تھا۔ یہ تھیں سروجنی نائیڈو۔ اپنی شاعری میں بھی اور زندگی میں بھی۔

کئی سال بعد سروجنی نائیڈو کی نظموں کا آخری مجموعہ "بانسری .... ایک عصائے شاہی" 1937 میں اچانک سامنے آگیا۔ لوگ حیرت میں رہ گئے۔ کیوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ گلے گلے قومی سیاست میں تھیں اور ایک عرصے سے نظمیں لکھنا چھوڑ چکی تھیں۔ سیاسی تناؤ اور ہنگاموں کے اِس ماحول میں یہ تازی ہوا کا ایک جھونکا سا لگا۔

اگرچہ کم عمری سے ہی اُن کی شاعری کی تعریفیں اور اچھی شاعری کی اُن سے اُمیدیں لگائی جاتی رہی تھیں لیکن وہ خود اِس بارے میں بہت اِنکسار سے کام لیتی تھیں۔ "میں شاعر واقعی نہیں ہوں" وہ اصرار کرتیں "میں نگاہ اور شوق تو رکھتی ہوں لیکن زبان نہیں رکھتی" وہ اپنے آپ کو صرف ایک گیت گانے والی بتاتی تھیں۔ لیکن کیسے مترنّم گیت تھے وہ اور سب کے لیے محبت اور نازک احساسات سے کتنے بھرے ہوئے۔ "سنہری دہلیز" میں اُنھوں نے گایا:

طنبورے ہاتھوں میں لیے ہمیشہ گاتے ہم گھومتے ہیں۔ سارے انسان ہمارے بھائی ہیں' دُنیا ہماری اپنی ہے۔

سروجنی نائیڈو اپنے بارے میں جو بھی کہیں حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے ادب میں

اُن کا مقام بہت اہم ہے۔ اُن کے الفاظ میں موسیقی ہے اور اُن کی نظمیں پڑھ کر جو تصویریں سی ذہن میں اُبھرتی ہیں وہ بہت خوبصورت ہیں۔ ہندوستان کے محنت کشوں کے لیے اُن کا درد، اپنے وطن کو غلامی سے آزاد کرانے کے اُن کے خواب اور تمام انسانوں سے اُن کی محبت سب حقیقی تھے۔ اُن کی شاعری نے نئے ہندوستانی ادب پر واضح نقوش چھوڑے ہیں۔

سروجنی 1898 میں انگلستان سے لوٹیں۔ وہ ڈاکٹر گووندا راجولو نائیڈو سے شادی کرنا چاہتی تھیں جو فوج میں ڈاکٹر تھے۔ اور اُن سے شادی کرنے کی درخواست تین سال پہلے کر چکے تھے۔ سروجنی کے والد شروع میں اس شادی کے خلاف تھے لیکن پھر شادی طے ہو گئی اور سروجنی پُر مسرت شادی شدہ زندگی گزارنے حیدر آباد ہی میں رہنے لگیں۔ ڈاکٹر نائیڈو کی دیکھ ریکھ وہ بڑی محبت اور توجہ سے کرتیں۔ اُنھوں نے اپنے چار بچوں کو بہت پیار سے پالا۔ حیدر آباد میں اُن کا گھر قہقہوں، محبت اور خوبصورتی سے بھرا رہتا تھا۔

اُن کا گھر سب کے لیے کھلا رہتا۔ دُور، نزدیک، ہر جگہ سے اُن کے دوست آتے رہتے۔ اُن سب کے لیے وہ بہت اچھی میزبان تھیں۔ وہ اُنھیں مزیدار کھانے کھلاتیں اور پُر لطف، مزاحیہ باتوں سے اُن کا دِل بہلاتیں۔ وہ اپنے گھر اور گھر والوں سے محبت کرتی تھیں۔ اُنھیں حیدر آباد شہر سے بہت پیار تھا۔ جہاں کی اعلا تہذیب اُن کے خون میں رچ بس گئی تھی۔ اردو شاعری سے اُنھیں عِشق تھا۔ اگرچہ وہ اپنی زیادہ تر تقریریں انگریزی زبان میں کرتی تھیں لیکن اردو زبان کی وہ دِلدادہ تھیں اور اُسے بڑی روانی کے ساتھ بولتی تھیں۔ وہ خوش اور مطمئن تھیں۔ اُس زمانے کی اُن کی نظمیں اُن کی سرمستی کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہیں۔

اپنے گھر کی دنیا میں اگرچہ وہ بہت خوش تھیں۔ لیکن اب تک جو وہ رہی تھیں اُس سے زیادہ کچھ ہونے کی اُمنگ اُن کو ہوتی تھی۔ اپنے گھر کی چہار دیواری کے باہر اُن کی نظریں کچھ ڈھونڈھتی تھیں۔ گوپال کرشن گوکھلے کی وہ اچھی دوست تھیں۔ وہ ہندوستان کے ایک چوٹی کی قومی رہنما تھے۔ جو ہندوستان کو آزاد کرانے کے کام میں لگے رہتے تھے۔ اُنھوں نے سروجنی نائیڈو پر زور ڈالا کہ وہ اپنے شیش محل سے نکلیں اور اپنی زندگی اور اپنے گیت اپنی قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔

سروجنی نائیڈو گاندھی جی سے ایک مرتبہ 1914 میں لندن میں ملی تھیں۔ اِس ایک ملاقات نے ہی اُن کی آئندہ زندگی کا راستہ طے کر دیا۔ اُنھیں عوامی زندگی میں کود پڑنا تھا اور وہ کود پڑیں اور اُس کے بعد اُنھوں نے پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

قومی سیاست میں

قومی سیاست میں داخل ہونے سے پہلے سروجنی نائیڈو نے گاندھی جی کے ساتھ 'جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کے خِلاف ہندوستانیوں کی جدو جہد میں ایک رضاکار (والنٹیر) کی حیثیت سے کام کیا۔ ہندوستان واپس آکر وہ فوراً آزادی کی تحریک میں شاملِ ہو گئیں۔ بالکل شروع سے وہ گاندھی جی اور اِنڈین نیشنل کانگریس کی وفادار رہیں۔ وہ طالب علموں اور نوجوانوں کے جلسوں کو خطاب کرتیں۔ بہت سے قصبوں اور شہروں میں اُنھوں نے عورتوں کے اور عام جلسوں میں تقریریں کیں۔

سروجنی نائیڈو کی اچھّی صحت تو کبھی بھی نہیں رہی لیکن وہ اِرادے کی بہت مضبوط تھیں۔ وہ حیرت ناک قوّت کے ساتھ کام کرتی رہیں نہ صِرف اُن دِنوں میں جب وہ جوان تھیں بلکہ اُس زمانہ میں بھی جب کہ اُن کی عمر زیادہ ہو چکی تھی۔ اُن کے ساتھی اور مدّاح حیرت کرتے تھے کہ اتنی انتھک طاقت اُن میں کہاں سے آئی۔

گاندھی جی سے پہلی ملاقات کے بعد اُن کا زیادہ وقت سیاسی کاموں کی نذر ہو جاتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ کانگریس کی ترجمان بن گئیں۔ آزادی کا پیغام پھیلاتی وہ بگولے کی طرح پورے ملک میں گھومتیں۔ جب کبھی اور جہاں کہیں بھی اُن کی ضرورت ہوتی وہ پہنچ جاتیں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کی کئی کمیٹیوں میں کام کرتیں اور مُلک کی سیاسی آزادی کی ضرورت پر بات کرنے کا کوئی موقعہ نہیں چھوڑتی تھیں۔

اِتنی ہی شِدّت کے ساتھ وہ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کا احساس پیدا کرتی تھیں۔ اور تعلیم کو عام کرنے پر زور دیتی تھیں۔ اپنی تقریر سننے والوں سے وہ یہ تقاضہ بھی کرتیں کہ وہ جہالت اور وہم پرستی کے اندھیرے سے باہر نکلیں اور رسم و رواج اور روایات کے اُس

جوئے کو اُتار پھینکیں جو ملک کو آنے والے زمانے کے بجائے گزرے ہوئے زمانہ کی طرف لیے جارہا ہے۔

کانگریس کی صدر

پورے ملک کی رہنما بن جانے میں سروجنی نائیڈو کو دیر نہیں لگی۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کی ایک بڑی رہنما شمار کی جانے لگی۔ 1925 میں اِنڈین نیشنل کانگریس کے کانپور میں ہونے والے اِجلاس میں وہ صدر چنی گئیں۔ اُس وقت تک اُنھیں گاندھی جی کے ساتھ کام کرتے ہوئے دس سال ہو چکے تھے اور اُنھیں سیاسی تجربہ بھی کافی ہو چکا تھا۔

آزادی سے پہلے ہندوستان میں کانگریس کا صدر ہونا ایک بڑا قومی اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ یہ اعزاز ایک عورت کو مِلنا اور بھی زیادہ اہم بات تھی۔ کانگریس کی صدر کی حیثیت سے گاندھی جی نے اُن کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا "پہلی مرتبہ ایک ہندوستانی خاتون کو وطن کی طرف سے سب سے اونچے اعزاز کا تحفہ ملے گا۔ اِس سال اُن کے حق کے طور پر اُنھیں یہ شرف ملے گا۔"

لیکن اپنے طور پر سروجنی نائیڈو نے کہا "اپنے چنے ہوئے خادِموں کا سردار مُجھے چُن کر آپ نے کوئی انوکھی پہل نہیں کی ہے۔ آپ نے محض اپنی ایک پرانی روایت پر عمل کیا ہے اور ہندوستانی عورت کو اُس کا وہ مقام پھر سے دیا ہے جو پہلے اِس کا ہوا کرتا تھا۔"

اپنے صدارتی خطبے میں سروجنی نائیڈو نے ہندوستان کی سماجی، اقتصادی، صنعتی اور ذہنی ترقی کی ضرورت کے بارے میں بات کی۔ ہندوستان کو ایک آزاد ملک بنا دینے کے لیے مِل جُل کر اور ہمّت کے ساتھ کام کرنے کے لیے اُنھوں نے ہندوستان کے لوگوں کو پکارا۔ اپنی تقریر کو اُنھوں نے اِن الفاظ کے ساتھ ختم کیا "آزادی کے لیے لڑائی میں خوف ایک ناقابل معافی غداری ہے اور مایوسی ایک ناقابل معافی گناہ ہے"

جرأت کی علامت

سروجنی نائیڈو نہ ڈرنا جانتی تھیں نہ مایوس ہونا۔ وہ جسارت اور بے خوفی کی بھرپور

علامت تھیں۔ 1919 میں پنجاب میں جلیانوالا باغ کے قتلِ عام کے بارے میں کون نہیں جانتا۔ سیکڑوں بے گناہ مردوں اور عورتوں کو وقت اُس بے دردی کے ساتھ جان سے مار ڈالا گیا جب وہ پبلک جلسوں پر پابندی کے سلسلے میں جنرل ڈائر کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چہار دیواری سے گھرے ایک باغ میں جمع ہوئے تھے۔

رولیٹ ایکٹ کے پاس ہو جانے پر ملک میں پہلے سے ہی تناؤ تھا جس نے ججوں کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ وہ سیاسی مقدموں کی شنوائی بغیر جیوری کے کریں اور سیاسی ملزموں کو واجبی کارروائی کے بغیر ہی جیل میں ڈال دیں۔ جلیانوالے باغ کے قتلِ عام سے پوری قوم غصّے سے بھڑک اُٹھی۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اِس وحشیانہ حرکت کے خلاف اپنا "سر" کا خطاب واپس کر دیا۔ سروجنی نائیڈو نے "قیصرِ ہند" کا وہ میڈل لوٹا دیا جو اُن کی سماجی خدمات کے سلسلے میں اُنھیں پہلے کبھی ملا تھا۔ احمد آباد کے گاندھی جی کے سابرمتی آشرم میں آزادی کے عہد نامے پر دستخط کرنے والے سب سے پہلے رضاکاروں میں وہ بھی شاملِ تھیں۔ گاندھی جی پہلے یہ نہیں چاہتے تھے کہ عورتیں ستیہ گرہ میں عملی حصّہ لیں۔ وہ اُن کے کاموں کو سوت کاتنے 'سودیشی پرچار کرنے 'شراب کی دُکانوں پر جمع ہو کر اُس کی بکری رُکوانے جیسے کاموں تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن سروجنی نائیڈو' کملا دیوی چٹوپادھیائے اور اُس زمانے کی دوسری رہنما خواتین کے اصرار پر گاندھی جی کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔

1930 کی مشہور نمک ستیہ گرہ کے دوران سروجنی نائیڈو اُن رضاکاروں میں سے تھیں جو گاندھی جی کے ساتھ ساتھ گئے تھے۔ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد اُنھوں نے ہی اِس تحریک کی اُس وقت تک قیادت کی جب تک کہ گجرات میں دھاراسانا کے مقام پر نمک کے تھالوں (کیاریوں) پر دھرنا دینے والوں کے ساتھ وہ خود گرفتار نہ ہو گئیں۔

عدم تشدّد پر قائم رہنے والے پُر امن ستیہ گرہ کرنے والوں پر دھاراسانا کے مقام پر پولیس کا زبردست لاٹھی چارج ہوا تھا۔ سروجنی نائیڈو نے بڑی ہمّت کے ساتھ صورتِ حال کا مقابلہ کیا۔ اور اپنی بے مثال خوش مزاجی سے ماحول کو پُر لطف بنائے رکھا۔

نمک ستیہ گرہ واپس لے لی گئی اور گاندھی اِروِن معاہدہ پر گاندھی جی اور ہندوستان کے وائسرائے لارڈ اِروِن نے دستخط کیے۔ یہ معاہدہ ایک سیاسی سمجھوتہ تھا۔ بعد میں 1931 میں گاندھی جی کو دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے لندن آنے کی دعوت دی گئی تاکہ "اپنے راج" کے لیے ہندوستان کی مانگ کی روشنی میں دستوری اصلاحات پر بات چیت کی جاسکے۔ اِس کانفرنس میں دوسروں کے ساتھ سروجنی نائیڈو بھی گاندھی جی کے ساتھ گئی تھیں۔

1935 کے حکومتِ ہند کے قانون نے ہندوستان کو کچھ دستوری حقوق دیے۔ کافی لمبی بات چیت کے بعد کانگریس نے صوبوں کی قانون ساز اسمبلیوں میں جانے کی تجویز مان لی۔ انتخابات میں حصہ لیا اور زیادہ تر صوبوں میں حکومتیں بنالیں جو 'عارضی حکومتیں' کہلائی گئیں۔

ہندوستان چھوڑو تحریک

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ دوسری عالمی جنگ کا اعلان ہو گیا۔ برطانوی حکومت نے زبردستی ہندوستان کو بھی جنگ میں کھینچ لیا۔ صوبوں کی کانگریس حکومتوں نے اِس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اِستعفے دے دیے۔ سمجھوتہ کرنے کے لیے بہت سی کوششیں ہوئیں۔ اِن میں سب سے اہم ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ 'سر اسٹیفورڈ کرپس کی تھی۔

کرپس مشن کے ناکام ہو جانے کے بعد کانگریس کے لیے بس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ عوامی تحریک شروع کرنے کا۔

8/ اگست 1942 کو کانگیرس کے بمبئی میں ہونے والے اِجلاس میں گاندھی جی نے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ دینے کا الٹی میٹم دے دیا۔ اُس کے ساتھ ہی اُنھوں نے ملک کے لوگوں "کرنے یا مرنے" کے لیے کہا۔ ہندوستان چھوڑو تحریک جو آزادی کے لیے ہندوستان کی جدو جہد کا آخری مرحلہ تھی اِس کا یہی جنگی نعرہ تھا۔

8/ اگست کی آدھی رات کو گاندھی جی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ گاندھی جی 'اُن کے پرائیویٹ سکریٹری مہادیو ڈیسائی اور سروجنی نائیڈو کو پونا کے 'آغا خاں پیلس' میں رکھا گیا۔ جلد ہی کستور با بھی اُن میں شامل ہو گئیں۔

اُن بُرے دِنوں میں جب گاندھی جی بہت افسردہ تھے تو سروجنی نائیڈو ہی تھیں جو اپنی خراب صحت کے باوجود اپنی حاضر جوابی اور قہقہوں سے گاندھی جی کو خوش رکھنے کی کوشش کرتیں۔ جب آغا خاں کے محل میں مہادیو ڈیسائی اور اُس کے کچھ عرصے بعد کستور با کا انتقال ہو گیا تو سروجنی نائیڈو نے گاندھی جی کو مضبوط سہارا دیا اور گاندھی جی کے برابر میں پہاڑ کی طرح جم کر کھڑی رہیں۔ پھر جب گاندھی جی نے مَرن برت رکھا اور اُن کی حالت زندگی اور موت کے درمیان ڈولنے لگی تب سروجنی نائیڈو نے ہی بڑے پیار اور توجہ کے ساتھ اُن کی دیکھ بھال کی۔

آزادی کی صُبح

تقریباً دو سال بعد گاندھی جی اور کانگریس کے دوسرے رہنما ایک ایک کر کے رہا کیے گئے۔ برطانوی حکومت اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کے ساتھ بات چیت کا پھر ایک دور شروع ہوا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی رائیں ایک دوسرے کے اُلٹ تھیں۔ برطانوی کیبنیٹ مِشن کی کوششیں جو 1946 میں ہندوستان آیا تھا ناکام رہیں۔ اِس کے باوجود مرکزی اور صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کے لیے چناؤ اور ایک عارضی قومی حکومت قائم کرنے کی تجویزیں مان لی گئیں۔

پنڈت نہرو کی صدارت میں ایک عارضی مرکزی حکومت بن گئی۔ کانگریس چاہتی تھی کہ پورے ہندوستان کو متحدہ طور پر حکومت کے اختیارات منتقل کیے جائیں۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست چاہتی تھی۔ سمجھوتے کے لیے بہت سی تجویزیں پیش کی گئیں۔ لیکن جب مسلم لیگ کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا تو کانگریس نے مجبور ہو کر ملک کی تقسیم کو مان لیا۔

14 ر اگست کی آدھی رات کو دو الگ الگ ریاستیں 'ہندوستان اور پاکستان بن گئیں۔ آزاد ہندوستان کا پہلا وزیر اعظم بنائے جانے کے لیے جواہر لال نے حلف لیا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں زبردست فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور بہت خون خرابہ ہوا۔ آزادی جھگڑوں اور مصیبتوں کو بھی ساتھ لائی۔

آزادی مل گئی۔ رہنماؤں کو جنھوں نے آزادی حاصل کرنے کے لیے ملک کی رہنمائی کی تھی اب دوسری طرح کے کام کرنے تھے۔ اب تک وہ لڑتے رہے تھے۔ اب اُنھیں قوم کی تعمیر کی ذمہ داریاں سنبھالنی تھیں۔ اس غرض سے اُن میں سے کچھ کو حکومت اور کچھ کو انتظامیہ کام سونپا گیا۔ اُنھیں میں سروجنی نائیڈو بھی تھیں۔ اُنھیں اُتر پردیش کا گورنر بنایا گیا جو رقبے اور آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ تھا۔ اِس عہدے کو قبول کرتے وقت انھوں نے کہا کہ وہ ایسا محسوس کرتی ہیں جیسے کسی 'آزاد پنچھی کو پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو'۔ لیکن وہ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی خواہش کی خلاف ورزی بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ جن سے وہ بہت محبت اور عقیدت رکھتی تھیں۔ اس لیے وہ لکھنؤ میں رہنے لگیں۔ اور اپنے سرکاری فرائض بڑی حُسن وخوبی اور وقار کے ساتھ انجام دینے لگیں۔

جلد ہی سارے ملک پر رنج و غم چھا گیا جب 30 ر جنوری 1948 کو گاندھی جی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ رنج میں ڈوبے ہوئے وزیر اعظم نہرو نے کہا "ہمارے درمیان سے روشنی اُٹھ گئی"۔ سروجنی نائیڈو نے اِن الفاظ میں گاندھی جی کو خراجِ عقیدت پیش کیا "اُن کے لیے عظیم موت صرف یہی تھی.... ذاتی سوگ منانے کا وقت ختم ہوا اب وقت ہے کھڑے ہو کر یہ کہنے کا جن لوگوں نے گاندھی جی کو اپنا کام کرنے سے روک دیا اُن کا چیلنج اب ہم قبول کرتے ہیں"۔

عورتوں کے حقوق کی چیمپئن

سروجنی نائیڈو کو خاص طور سے ایک قومی رہنما اور عورتوں کے حقوق کی علم بردار کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ قومی رہنما کی حیثیت سے ہندوستان کی سیاسی محکومی کا اُنھیں ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ ایک عورت ہونے کے ناطے وہ ہندوستان کی عورتوں کی افسوس ناک حالت

سے آگاہ تھیں۔ اُن کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں سے وہ سخت ناراض ہوتی تھیں۔ اُن کو بُنیادی حقوق سے محروم رکھنے پر وہ بگڑ پڑتی تھیں۔ وہ عام معنوں میں خاتون نواز نہیں تھیں۔ لیکن ہندوستانی عورتوں کو جن مسائل اور شخصیتوں کو جھیلنا پڑتا تھا اُن سے وہ بخوبی واقف تھیں۔ عورتوں کو تعلیم سے محروم رکھے جانے اور اُن سماجی رسومات پر جو عورتوں کو باندھ کر رکھنے والی زنجیریں بن جاتی ہیں' وہ بہت ناراض ہوتی تھیں۔

سروجنی نائیڈو عورتوں کے حقوق کی لڑائی کو ہندوستان کی آزادی کی جدّوجہد کا ہی ایک حصّہ سمجھتی تھیں۔ وہ اپنے الفاظ کا سارا زور مردوں اور عورتوں کو یہ سمجھانے پر صرف کرتی تھیں کہ عورتوں کو تعلیم ضروری ہے۔ اپنی تقریر سُننے والوں کو وہ ہمیشہ یاد دِلاتیں کہ عہدِ وسطیٰ' کے اندھیارے چھا جانے سے پہلے ہندوستان میں عورتوں کا کیا احترام اور عزّت ہوتی تھی۔

اُن کے نزدیک اپنی آزادی کی طرف عورتوں کی پیش قدمی میں سب سے اہم قدم تعلیم تھی۔ تعلیم حاصل کر کے ہی وہ اپنے گھر اور سماج کے لیے بہترین کام کر سکتی تھیں۔

اِس قول کا بھی ذِکر وہ کرتیں کہ ''جو ہاتھ گہوارے کا جھلاتے ہیں۔ وہی دنیا پر راج کرتے ہیں''۔ لیکن وہ کہتیں ''ایک جاہل عورت یہ نہیں کر سکتی۔''

وہ اپنے حقوق اور اپنی طاقت کے بارے میں عورتوں کی آگاہی کو بھی اتنا ہی اہم سمجھتی تھیں جتنا اُن کی تعلیم کو۔ اور وہ جہاں کہیں بھی جاتیں اِنھیں باتوں پر زور دیتیں۔

عورتوں کی ترقّی کے لیے اُن کی تشویش کو دیکھتے ہوئے یہ قدرتی بات تھی کہ 'عورتوں کی کل ہند کانفرنس' کے ساتھ وہ بالکل شروع ہی سے وابستہ رہیں۔ یہ ملک میں عورتوں کی سب سے پرانی اور سب سے اہم تنظیم ہے۔ بہت سے سیاسی' اِقتصادی' اور قانونی حقوق' ہندوستان کی عورتوں کو دِلوانے میں جو آج اُن کو حاصل ہیں' اِس تنظیم کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اِس کو لیڈی دھنونتی راما راؤ' اور ملک بھر کی بہت سی سماجی کارکنوں کی خدمات سے فائدہ پہنچا ہے۔ ہندوستان کی بہت سی صفِ اوّل کی خواتین جیسے وِجے لکشمی پنڈت' کملا دیوی چٹوپادھیائے' لکشمی مینن' نہا بین مہتہ اور بہت سی دوسری خواتین اِس تنظیم سے وابستہ رہی

ہیں۔ عورتوں کے حقوق کے لیے زبردست کام کرنے والی مشہور انگریز خاتون مارگریٹ گزنس سے بھی اِس تنظیم کو عملی رہنمائی ملی ہے۔ اِس تنظیم کے تمام اہم کاموں میں سروجنی نائیڈو کی ہدایت اور رہنمائی بھی شامل رہی ہے۔ عورتوں کی ترقی کے لیے اُن کے قابلِ قدر کاموں اور تنظیم کے لیے اُن کی خدمات کے اعتراف میں 'نئی دہلی میں' عورتوں کی کُل ہند کانفرنس' کے مرکزی دفتر کی جو عمارت بنی اُس کا نام 'سروجنی نائیڈو ہاؤس' ہی رکھا گیا ہے۔

لیکن سروجنی نائیڈو کو اِس عمارت کی وجہ سے یاد نہیں رکھا جائے گا۔ بلکہ اِس دیس کی عورتوں کے لیے اُنھوں نے جو کچھ کیا اُس سب کے لیے اُنھیں یاد رکھا جائے گا۔ وہ یاد رکھی جائیں گی اپنے اُن جھنجھوڑ دینے والے الفاظ کی وجہ سے جنھوں نے عورتوں کو اپنے حقوق' اپنی طاقت کا احساس اور شعور بخشا اور جن کی وجہ سے وہ بہتر شہری اور بہتر انسان بن سکیں۔

حُسن و خوبی کی دِلدادہ

اپنی تمام سنجیدہ 'سیاسی اور سماجی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ سروجنی نائیڈو گیت اور قہقہوں کے ہی علامت تھیں۔ چاہے وہ ایک بہت بڑے عام جلسے کو خطاب کر رہی ہوں یا طالب علموں اور عورتوں کی مختصر جماعت سے بات کر رہی ہوں یا یونی ورسٹی کے کامیاب طالب علموں کی سندیں تقسیم کرنے والے جلسے میں بول رہی ہو۔ اُن کی تقریر ہمیشہ ایک گیت سا لگتی تھی۔ اُن کی تقریر کے الفاظ میں ایک موسیقیت ہوتی اور اُنھیں وہ اپنی سریلی آواز میں ادا کرتیں جو بعض اوقات ایک دہاڑ بن جاتی تھی۔ خوبصورتی اور رنگ سے اُن کو بہت ہی زیادہ لگاؤ تھا۔ اُس زمانے کے کھادی پوش رہنماؤں 'بڑے بڑے سنجیدہ لوگوں اور رضاکاروں کے بر خلاف وہ رنگین جھل مل کرتا ریشمی لباس پہنے پھرا کرتی تھیں۔ اُن کے گلے میں بھاری ہار اور کانوں میں لٹکتے لمبے بُندے بھی جھولتے نظر آتے۔ ہر عمدہ اور حسین چیز سے اُنھیں دل چسپی تھی۔ 1928 میں اپنے امریکی دورے کے درمیان وہ ''چمکتے تاروں کے جھرمٹ والے'' ہالی ووڈ بھی گئیں۔

اچھے لباس کی طرح لذیذ کھانے بھی اُنھیں بہت پسند تھے۔ اور چاکلیٹ اور کباب تو اُن کی کمزوری تھے۔ ڈاکٹر کے منع کرنے پر بد پرہیزی کرنے میں اُنھیں لطف آتا تھا۔ بڑے

اہتمام کے ساتھ کی جانے والی دعوتوں میں بھی وہ شریک ہوتیں اور بمبئی کے جوہو بیچ (سمندر کے کنارے) پر وہ بھیل پوری بھی مزے لے لے کر کھاتیں۔

اُن کا انداز ہمیشہ غیر رسمی سا ہوتا تھا۔ گورنر کی حیثیت سے بھی' قاعدوں اور ضابطوں سے ہٹ کر وہ لوگوں کی مدد کرتیں' خاص طور پر نوجوانوں کی۔ دیس کے نوجوانوں سے وہ بہت محبت کرتی تھیں۔ اور اُن پر بہت بھروسہ رکھتی تھیں۔ اپنی جواں مزاجی کو اُنھوں نے آخر تک برقرار رکھا۔ بیماری اور بڑھاپے کو اُنھوں نے کبھی مان کر نہیں دیا۔

لکھنو کی اپنی سرکاری رہائش گاہ میں دھوپ میں بیٹھی ہوئی وہ اکثر جاسوسی ناول پڑھتی ملتیں۔ بات کرتے اور کام کرتے وقت وہ محبّت کا مجسمہ لگتیں۔ وہ ایک محبت کرنے والی بیٹی' بیوی 'اور ماں تھیں۔ دنیا بھر میں دوست بنا لینے کا اُنھیں گُر آتا تھا۔ اپنی دوستی کی وہ قدر کرتیں۔ گاندھی جی اور گوکھلے کے علاوہ رابندر ناتھ ٹیگور اور سی ایف اینڈریوز اُن کے بہت اچھے دوست تھے۔ گاندھی جی کو وہ ایک "دوست اور استاد" مانتی تھیں۔ گاندھی جی کے ساتھ وہ قہقہے لگاتیں۔ دونوں کی طبیعت میں مِزاح تھا۔ اور دونوں اُس سے خوب لطف اُٹھاتے۔ وہ گاندھی جی سے اتنی بے تکلف ہو جاتیں جتنی بے تکلفی کی دوسرے رہنما ہمّت بھی نہیں کرتے تھے۔ جواہر لال نہرو' کو وہ چھوٹے بھائی جیسا سمجھتی تھیں۔ اندرا کی پیدائش کا خیر مقدم اُنھوں نے ہندوستان کا 'نیا جذبہ' کہہ کر کیا کیسی سچی پیشن گوئی ثابت ہوئی؟

سروجنی نائیڈو کو زندگی سے محبت تھی۔ اور ہر اُس چیز سے جو زندہ تھی۔ جن میں پھول پودے بھی شامل تھے۔ پوری انسانی نسل کو وہ اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھیں۔

2 رمارچ 1949 کو جب سروجنی نائیڈو کا انتقال ہوا وہ گورنر کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھیں۔ یہ صرف جسمانی موت تھی۔ اپنی ایک نظم میں اُنھوں نے موت سے ذرا دیر ٹھہرے رہنے کو کہا۔

"جب تک میری زندگی کی تمام زبردست خواہش پوری نہیں ہو جاتیں۔ میں نہیں آؤں گی"۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اُنھوں نے ایک مفید اور بھرپور زندگی گزاری۔ لیکن کیا اِس زندگی سے وہ خود بھی مطمئن تھیں؟ کوئی نہیں بتا سکتا۔ لیکن اُن کی زندگی کے بارے میں جتنا

کچھ معلوم ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد طے کیا تھا اور اُسی کے لیے زندگی گزارنے کی کوشش کی۔

ایسی زندگی بہت زیادہ لوگوں کو نہیں ملتی۔ انھوں نے کہا "زندگی کے غموں" کو گیتوں کے درد سے 'مِٹاڈالنے کی کوشش کی۔ اِسی طرح اُنھوں نے زندگی بسر کی۔ اُن کے بعد آنے والی نسلیں اِسی کے لیے اُنھوں یاد رکھیں گی۔ اُن کو یاد رکھنے کی صِرف یہی صورت ہے۔ سروجنی نائیڈو جو چاہتے اور گانے کے لیے زندہ رہیں! وہ واقعی ہندوستان کی کوئل تھی۔ گاندھی جی اُنھیں "بھارت کوکِلا" کہا کرتے تھے۔

(اردو والے اُنھیں 'بُلبلِ ہند' کہتے رہے ہیں)

ابوالکلام آزاد

ایس۔ جی۔ حیدر

"وہ ہندوستان میں دھیرے دھیرے اُبھرنے والی ملی جلی عظیم تہذیب کے اعلی درجے کے خاص اور سچے نمائندے تھے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُس ملی جلی تہذیب کے ہر نمائندہ شخص کو بالکل مولانا آزاد کی ہی طرح ہونا ضروری ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اِس تہذیب کے بہت سے نمائندے ہیں۔ لیکن اُن کی اپنی رہائش گاہ' یہاں دہلی' کلکتہ یا بنگال میں جہاں اُنھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ گزارا' اُن کی شخصیت اُن مختلف تہذیبوں کی آمیزش (میل) کی نمائندگی کرتی تھی جو ایک کے بعد ایک ہندوستان آئی ہیں' دریاؤں کی طرح بہتی ہوئی اور آکر ہندوستانی زندگی کے سمندر میں 'گم' ہو گئیں۔ ہندوستان میں پہلے سے بسنے والے لوگوں نے اُن پر اثر ڈالا۔ اُنھیں بدلا اور خود بھی اُن کے اثر سے تبدیل ہوئے۔"

جواہر لال نہرو

ابوالکلام آزاد

جنگِ آزادی کے دو سپاہی 'مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو' ایک سال کے فرق سے 1888 اور 1889 میں پیدا ہوئے۔ چند ہی سال پہلے 1885 میں اِنڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تھی۔ عظیم کمانڈر اور گرو گاندھی جی پہلے ہی 1869 سے یہاں موجود تھے۔ ہندوستان کی آزادی کی جدّو جہد۔ 'بنا ہتھیاروں کی مہابھارت' کے لیے جنگ کا میدان تیار ہو رہا تھا۔

مکہّ (عرب) میں رہ رہے ایک ہندوستانی باپ اور عرب ماں کے ایک بیٹا محی الدین احمد پیدا ہوا' جس کا نام فیروز بخت بھی تھا۔ جو بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد یا صِرف مولانا صاحب کے نام سے مشہور ہوا۔

شروع ہی سے اِس بچے میں ایک امتیازی خصوصیت پائی گئی جو تمام عمر ان میں دکھائی دی۔

عام لوگ صرف ایک مولانا آزاد کو جانتے ہیں۔ قومی رہنما کو' جو واقعی وہ تھے' لیکن کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ لیڈر بننا اُنھوں نے کبھی نہیں چاہا تھا۔ اپنے ایک دوست کو اُنھوں نے لکھا "سیاسی زندگی کے پیچھے میں کبھی نہیں بھاگا۔ دراصل سیاست نے آکر مجھے گھیر لیا......"

مولانا آزاد ایک عالم' اخبار نویس' مصنف شاعر' فلسفی اور سب سے بڑھ کر اپنے وقت کے ایک بڑے مذہبی عالم تھے۔

مہاتما گاندھی کی طرح وہ بھی ہندوستان کی مختلف قومیتوں' خاص کر ہندو مسلمانوں میں

اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ اور گاندھی جی ہی کی طرح اُنھیں زندگی بھر دو دشمنوں سے لڑنا پڑا۔ برطانوی حکومت سے اور اُن لوگوں سے جو ہماری قوم کے اتحاد میں یقین نہیں رکھتے تھے۔

دوسرے بچوں کی طرح مولانا آزاد کو بھی بچپن میں گیس بھرے رنگین غبارے اچھے لگتے تھے اور وہ بھی تیرنے اور کھیلنے کودنے کے شوقین تھے۔ اُن کا حافظہ بہت تیز تھا اور معلومات حاصل کرنے ' پڑھنے ' لکھنے اور بولنے کی اُن کی خواہش ہمیشہ بڑھتی ہی گئی۔ دوسرے بچوں کی طرح اسکول جانے 'اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ رہنے ' آزادی کے ساتھ کھلی جگہوں پر کھیلنے اور بچوں جیسی شرارتیں کرنے کو اُن کا بھی جی چاہتا تھا۔ لیکن اُنھیں یہ سب کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اُن کے والد اُن کو ایک پکا مذہبی عالم بنانا چاہتا تھے اور اِس لیے اِس طرح کی فضولیات میں اُنھیں وقت ضائع کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

عالم

آزاد کے پاس بہت ساری کتابیں تھیں اور قابل استاد تھے جو اُنھیں عربی' فارسی ' اُردو ' اور مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ ریاضی (حساب) طِب (یونانی طریقۂ علاج) خطاطی (خوش نویسی) اور دوسرے علوم سکھاتے تھے۔ لیکن انگریزی سیکھنے کی اُنھیں بالکل اجازت نہیں تھی کیوں کہ یہ قابلِ نفرت فرنگیوں (انگریزوں) کی زبان تھی۔ خوش قسمتی سے اُنھیں انگریزی جاننے والے ایک صاحب مل گئے جن سے اُنھوں نے اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ سیکھی اور پھر پہلی کتاب پڑھی۔ اس کے بعد بہت جلدی (ذہین تو تھے ہی) ڈکشنری کی مدد سے وہ اخبار اور 'بائبل' بھی پڑھنے لگے۔

چراغ کی دھیمی روشنی میں وہ رات کو دیر تک ' کبھی کبھی صبح ہو جانے تک پڑھا کرتے تھے۔ اِس شوق میں بعض اوقات وہ کھانا کھانا بھی بھول جاتے تھے۔ اکثر اپنے پیسے وہ کتابیں خریدنے پر صرف کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں "لوگ اپنا بچپن کھیل 'کود' میں گزارتے ہیں لیکن بارہ تیرہ سال کی عمر میں 'کوئی کتاب اُٹھا کر میں گھر کے ایک کونے میں جا بیٹھتا تھا۔ تاکہ لوگ مجھے نہ دیکھ سکیں"۔

اُن کی تحریر کے بارے میں ایک بڑے عالم نے لکھا "انگریزی زبان کے مشہور مصنف "سمر سیٹ مام' کی طرح مولانا آزاد نے لکھنا اسی طرح سیکھا جیسے مچھلی کے بچے 'تیرنا' یا انسان کے بچے 'سانس لینا' سیکھتے ہیں"

پیش بین (آگے دیکھ لینے والا)

ایک انوکھی بات اُن میں یہ رہی کہ بہت سے معاملات میں وہ ہمیشہ اپنی عمر سے بہت آگے کے کام کرتے رہے۔ اُنھوں نے ایک لائبریری' ایک ریڈنگ روم' اور بحث و مباحثے کی ایک سوسائٹی قائم کر رکھی تھی جب کہ اُن کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ جب وہ پندرہ سال کے تھے تو اپنے سے تقریباً دُگنی عمر کے طالب علموں کو پڑھانے لگے تھے۔ تیرہ سے اٹھارہ سال کی عمر میں وہ کئی رسالوں کے ایڈیٹر رہے۔ اور سولہ سال کے تھے جب اُنھوں نے ایک اعلیٰ پائے کا رسالہ خود نکالنا شروع کر دیا۔ 1923 میں جب وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر چنے گئے تو جواہر لال نہرو کے کہنے کے مطابق وہ کانگریس کے سب سے کم عمر صدر تھے۔

1904 میں لاہور کے لوگوں نے مولانا آزاد کو جن کے عالمانہ مضامین سے وہ بہت متاثر تھے۔ قومی سطح کے ایک اہم جلسے کو خطاب کرنے کے لیے بُلایا۔ اُن کے استقبال کے لیے ہزاروں کی بھیڑ لاہور اسٹیشن پر جمع تھی۔ لیکن جب ایک دُبلا پتلا گورا چٹا' سولہ سال کا نوجوان جس کے ابھی داڑھی بھی نہیں نکلی تھی' فرسٹ کلاس کے ڈبے سے نکلا تو اوّل تو اُن کو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ ہی نوجوان 'مولانا آزاد' ہے۔ پھر اُنھیں بڑی حیرت اور کچھ مایوسی بھی ہوئی۔ لیکن جب اِس لڑکے نے ڈھائی گھنٹے سے زیادہ لمبی' یادگار تقریر کی تو سرسٹھ سال کے بوڑھے 'جلسہ کے صدر' مشہور شاعر اور عالم' مولانا حالی نے اُنھیں گلے سے لگاتے ہوئے کہا "عزیز صاحبزادے! مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پر تو بہر حال یقین کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن حیرت مجھے اب بھی ہے"

اسی طرح 1910 کے قریب یہ شرمیلا سا نوجوان' جو اپنا فوٹو چھپوانے کے لیے بھی آمادہ نہیں تھا۔ کمزور صحت لیکن 'پختہ ارادے والا' 'شگفتہ دِل لیکن ٹھنڈے دماغ والا' نفاست کا عادی لیکن فیصلے کا اٹل' بلا کا ذہین مگر نرم مزاج' عظیم ہندوستانی سپاہیوں کی اُس فوج میں

شامل ہونے کے لیے تیار تھا جو قوم کو آزادی کی طرف لے جانے والی تھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ وہ کتاب کا کیڑا تھے۔ سردیوں کے موسم، تنہائی، موسیقی اور عمدہ چائے کے وہ رسیا تھے۔ وہ صبح بہت سویرے اُٹھنے والے اور وقت کے پابند تھے۔ اپنے پیارے وطن اور اُس کے لوگوں کی خاطر وہ ہر تکلیف کو برداشت کرنے اور ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔

گاندھی جی جنوبی افریقہ میں تھے۔ وہاں بسے ہندوستانیوں کے لیے جدو جہد میں مصروف، اُن کے ہونے والے ایک ساتھی، جواہر لال نہرو، یورپ سے آکر اپنے میدان جنگ یعنی ہندوستان کے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔

اُن کے ہونے والے ایک اور ساتھی مولانا آزاد نے ہندوستان میں، آگ لگا دینے والی اپنی تقریروں، زور دار تحریروں اور ہندوستان کے پڑھے لکھے مسلمانوں سے رابطہ قائم کر کے، آزادی کے لیے جنگ کی تیاریاں پہلے سے ہی شروع کر دی تھیں۔ بنگال کے ایک انقلابی، شیام سُندر چکرورتی سے اُنھوں نے انقلابی کاموں کی کچھ تربیت بھی لی تھی۔ اور اُنھیں کے ذریعے عظیم انقلابی آروبندو گھوش سے 1905 میں ملے تھے۔ اُنھوں نے مسلمانوں میں چند خفیہ کلب بھی قائم کیے تھے۔

مولانا آزاد محسوس کرتے تھے کہ 1857 کی جنگِ آزادی کے بعد، بعض وجوہت کی بنا پر ہندوستان کے مسلمان اپنے دوسرے بھائیوں سے اکثر معاملات میں پیچھے رہ گئے تھے۔ اُن میں سے بہت سے یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان پر اب ہمیشہ انگریزوں کا راج رہے گا اِس لیے اُن کے خلاف اب لڑنا بے کار ہے۔ لیکن مولانا اخبار میں مضمون لِکھ لِکھ کر اُنھیں یہ بتاتے رہے کہ غیر ملکی حکومت کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا نہ صرف ایک قومی تقاضہ ہے بلکہ مذہبی فریضہ بھی ہے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے اعلان کیا ”مسلمانوں کے لیے یہ آسان ہے کہ وہ سانپوں اور بچھوؤں کے ساتھ اَمن سے رہیں۔ پہاڑوں میں جاکر غاروں اور بھٹوں میں رہنے لگیں اور جنگلی جانوروں کے ساتھ اَمن کی زندگی گزاریں لیکن انگریزوں سے صلح کی بھیک مانگنا اُن کے لیے ممکن نہیں ہے“۔ اپنے اِس پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے اُنھوں نے 1912 میں اپنا مشہور ہفتہ وار اخبار الہلال نِکلا۔

اَلہلال

اب تعجب ہوتا ہے کہ یہ اخبار ہندوستان اور اُس کے باہر کتنی جلدی مقبول ہو گیا۔ چند مہینوں میں الہلال کی چھبیس ہزار کاپیاں نکلنے لگیں۔ لوگ اکھٹے ہو ہو کر جماعت کے سبق کی طرح اخبار کا ایک ایک لفظ پڑھتے یا سُنتے تھے۔ بہت جلد اخبار نے اپنے پڑھنے والوں میں بیداری کی ایک لہر سی دوڑا دی' نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ دوسروں میں بھی' کیوں کہ اُس زمانے میں اردو پڑھنے والے بہت لوگ تھے۔

پریشان ہو کر حکومت نے پہلے دو ہزار روپے کی ضمانت مانگی اور ضبط کر لی۔ پھر دس ہزار روپے کی ضمانت مانگی اور وہ بھی ضبط کر لی۔ آخر میں مولانا کو حکومت کے خلاف لکھنے کے الزام میں بنگال سے نکال دیا۔ بعد میں اُنھیں بہار میں رانچی کے مقام پر چار سال سے زیادہ عرصے کے لیے قید میں رکھا گیا۔

گاندھی جی' جو مولانا آزاد کی زوردار تحریروں سے واقف تھے' رانچی جیل میں اُن سے ملاقات کرنی چاہی لیکن حکومت نے اِس کی اِجازت نہیں دی۔ جنوری 1920 میں اپنی رہائی کے فوراً بعد' مولانا آزاد دہلی میں حکیم اجمل خاں کے مکان پر گاندھی جی سے ملے۔ اِس ملاقات کا ذِکر کرتے ہوئے مولانا نے بعد میں لکھا... "آج تک... جیسے کہ ہم نے (مولانا اور گاندھی جی) ساتھ رہ کر زندگی گزاری ہو... ہم میں اختلاف بھی ہوتا تھا... لیکن ہم الگ الگ راستوں پر کبھی نہیں چلے... دِن بہ دِن اُن پر میرا اعتماد بڑھتا ہی چلا گیا۔" دوسری طرف گاندھی جی نے کہا "مجھے مولانا کے ساتھ 1920 سے کام کرنے کا موقعِ ملا۔ وطن سے اُن کی محبّت اتنی ہی پختہ ہے جتنا اِسلام پر اُن کا اعتقاد۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے سب سے بڑے رہنماؤں میں سے ہیں۔ اِس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے"۔

اِتحاد

مولانا شروع سے اِس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ صِرف اُسی وقت ایک بڑی قوم بن سکتے ہیں جبکہ اُن میں اِتحاد ہو۔ گاندھی جی کی طرح اُن کے دِل کو بھی کوئی

چیز اتنی عزیز نہیں تھی جتنی کہ لوگوں میں اتحاد۔ اور گاندھی جی ہی کی طرح جنھوں نے اپنی زندگی قومی اتحاد کے لیے قربان کر دی' مولانا آزاد بھی قومی اتحاد کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔

1923 میں اِنڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں اپنے پہلے صدارتی خطبے میں اُنھوں نے کہا "آج اگر کوئی فرشتہ آسمان سے اُتر کر دہلی کے قطب مینار کی بلندی سے اعلان کرے کہ ہندوستان کو چوبیس گھنٹے کے اندر سوراجیہ مِل جائے گا اگر وہ ہندو مسلم اتحاد کا خیال چھوڑ دے تو میں ہندو مسلم اتحاد کے مقابلے میں سوراجیہ کو قبول نہیں کروں گا۔ کیوں کہ اگر سوراجیہ مِلنے میں دیر ہوئی تو صرف ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر اتحاد نہ ہو سکا تو دنیا کی پوری اِنسانیت کا نقصان ہوگا۔"

بد قسمتی سے کچھ لوگ تھے جو یہ اتحاد نہیں چاہتے تھے۔ یہ لوگ زندگی بھر مولانا آزاد کی شدید مخالفت کرتے رہے۔ ان لوگوں نے اُن کے طرح طرح کے نام رکھے۔ مذاق اڑایا' بُرا بھلا کہا اور طعنے دیے لیکن مولانا نے کبھی اُن کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا۔

1924 میں گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کے لیے اکیس دن کچھ نہیں کھایا۔ 'آمرن انّشن برت" رکھا۔ مولانا آزاد تمام قومیتوں کے لوگوں کے پاس دوڑتے پھرے کہ وہ لڑائی جھگڑا بند کر دیں۔ وہ گاندھی جی سے اپنا برت ختم کرنے کی درخواست کرتے رہے۔ اسی طرح گولی لگنے سے کچھ دِن پہلے اسی غرض سے گاندھی جی کے برت رکھنے پر وہ 'دیوانہ وار' لوگوں کے پاس دوڑتے پھرے۔ دراصل اپنے وطن اور اُس کے لوگوں سے محبت اور اپنے فرض کا یہ احساس ہی تھا جس نے ایک پڑھنے لِکھنے والے شخص' مولانا آزاد' کو اُن کے کتب خانے سے نِکال کر وطن کے لاکھوں باسیوں کے درمیان لا کر کھڑا کر دیا۔ وہ یقیناً ایک عجیب و غریب انسان تھے۔ دِن بھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اہم معاملات پر گفتگو کرنے 'ملک کی قِسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے' وفد کو یہاں وہاں لے جانے یا دِن بھر چلنے والے کانگریس کے اِجلاس کی صدارت کرنے کے بعد لوگ اُنھیں شام یا آدھی رات کو' خود بنائی ہوئی لطیف چائے کی ایک پیالی سامنے رکھے کسی سنجیدہ' علمی' ادبی' یا مذہبی تحریر میں مصروف پاتے۔ مولانا کو واقعی جو اپنے ذہن پر کمال کی قدرت حاصل تھی۔

اور وہ اپنے وقت کا بہترین استعمال کر سکتے تھے۔

ہندوستان چھوڑو

8راگست 1942 کی رات میں دیر گئے مولانا آزاد کی صدارت میں 'آل انڈیا کانگریس کمیٹی' کے تاریخی جلسے نے برطانوی حکومت سے ہندوستان چھوڑ دینے کو کہا۔ دوسرے دِن صبح کو سب بڑے بڑے نیتا ایک اسپیشل ریل گاڑی کے ڈبوں میں سوار تھے۔ گاڑی پونا میں رُکی اور گاندھی جی اور سروجنی نائیڈو کو وہاں اُتارا گیا۔ شام کے وقت مولانا اور اُن کے ساتھیوں کو احمد نگر کے تاریخی قلعے لے جایا گیا۔ وہاں سے اُنھوں نے اپنے دوست کو لکھا "نو مہینے پہلے نینی سینٹرل جیل کے دروازے میرے لیے کھولے گئے تھے۔ اور کل 9 اگست 1942 کو احمد نگر کے پرانے قلعے کا نیا دروازہ میرے پیچھے بند کر دیا گیا۔"

اگلے دِن اُنھوں نے لکھا"... یہ چھٹا تجربہ ہے... پچھلی پانچ باریوں کی کُل مدّت... سب ملا کر... سات سال آٹھ مہینے بنتی ہے... یہ میری موجودہ ترپن سال کی عمر کا ساتواں حصّہ ہوتی ہے" چھٹی باری کے آخر (جولائی 1945) میں اُن کی قید کی کُل مدّت دس سال پانچ مہینے ہوئی۔

احمد نگر قلعہ کی جیل ایک چھوٹی اور خاموش جگہ تھی۔ کوئی میٹنگ نہیں۔ بحث و مباحثہ نہیں، جلوس نہیں اور تقریریں نہیں۔ اُن کی پسندیدہ کتابیں بھی وہاں کم تھیں۔

جیل میں ایک شام کو مولانا کے ایک چھوٹے سے کمرے میں عام گھریلو چڑیوں نے بلّہ بول دیا۔ چیں چیں کرتی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اُڑتی پھرے جا رہی تھیں۔ مولانا کھدّر کا سفید کرتا پائجامہ پہنے۔ مسلمان مولویوں جیسی مختصر داڑھی رکھے۔ ہاتھ میں لمبا بانس لیے' پلنگ پر چڑھے۔ شو شو کر کے اُنھیں بھگانے کی کوشش میں اِدھر سے اُدھر کود پھاند رہے تھے۔ چڑیاں بھاگتیں' پھر آ جاتیں۔ آخر مولانا تھک گئے اور ہانپتے ہوئے پرانے صوفے پر جا لیٹے۔ کچھ دیر بعد اُٹھ کر اُنھوں نے اپنی ٹوپی' شیروانی' میز پر رکھی ہوئی چند کتابیں اور کاغذات جھاڑے۔ پلنگ کے نیچے سے جھاڑو نکالی اور ہر جگہ سے دھول سمیٹی' اور چڑیوں کی

بیٹ سمیٹ کر ایک طرف ڈالی۔ وہ جھاڑ دیتے جاتے اور اردو کے شعر گنگناتے جاتے۔ آخر میں نمٹ کر بولے ''آؤ اب دوستی کر لیں''

ایک دِن شام کی خاموشی میں ہر طرف سے بے خبر وہ لکھنے میں مصروف تھے۔ ایک چڑیا اوپر سے اُتر کر پہلے صوفے پر آکر بیٹھی۔ پھر اُچک کر اُن کی کُرسی پر آئی اور آخر میں مولانا کے کندھے پر۔ مولانا نے بغیر گردن گھمائے 'بائیں آنکھ کے کونے سے' بڑے پیار سے اُسے دیکھا اور بائیں ہاتھ کی مٹھی کھول دی' جس میں باجرے کے کچھ دانے تھے۔ چڑیا آہستہ آہستہ پھدک کر اُن کی ہتھیلی کے کنارے پر آئی اور ایک ایک دانہ چگنے لگی۔ آخر مولانا کی چڑیوں سے دوستی ہو ہی گئی۔

دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی اور چڑیا پُھر سے اُڑ گئی۔

''اوہ! معاف کیجئے گا مولانا صاحب میں نے آپ کے دوست کو بھگا دیا۔

''کون؟ جواہر لال 'تشریف لائیے''

''آج آپ باغبانی کے لیے نہیں آرہے ہیں''؟

''ہاں۔ ضرور ضرور 'کیوں نہیں۔''

اور وہ فوراً جیل کے دوسرے ساتھیوں 'سردار ولبھ بھائی پٹیل' آصف علی 'پنڈت گووِند بلبھ پنت' آچاریہ کرپلانی 'ڈاکٹر سید محمود اور جواہر لال وغیرہ کے ساتھ جاملے۔

پُرسکون

چند مہینے بعد جیل کا انگریز سپرنٹینڈینٹ 'پوری فوجی وردی پہنے آیا اور اُس نے دھیرے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''تشریف لائیے''۔

''یہ آج کا اخبار ہے۔ سر' اِس میں آپ کے لیے ایک اہم خبر ہے۔''

"بہت بہت شکریہ۔" مولانا نے بغیر اُس کی طرف مڑے ہوئے نرمی سے لیکن بھرّائی ہوئی آواز میں کہا" برائے مہربانی اِسے یہاں چھوڑ جایئے۔"

افسر باہر چلا گیا اور مولانا نے بھاری قدموں سے چل کر اخبار اُٹھایا۔ کچھ پڑھا اور صوفے پر تقریباً ڈھیر ہو گئے۔ وہ خیالات میں ڈوبے ہوئے اور بڑے افسردہ تھے۔

کچھ دیر بعد جواہر لال اور مولانا میں گفتگو ہو رہی تھی۔ جواہر لال کچھ کہہ رہے تھے اور مولانا سوچ میں ڈوبے ہوئے گردن ہلا رہے تھے۔ آخر سنبھل کر انھوں نے کہا "کچھ بھی ہو جائے میں اِن سے ۔۔۔ دیس کے دشمنوں سے ۔۔۔ اُس سے ملنے کی بھیک نہیں مانگوں گا۔"

جواہر لال چلے گئے۔ آنکھیں جُھکائے 'اُداس' مولانا بھاری قدموں سے اپنے کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگے۔

کچھ دِن بعد جواہر لال ہی نے مولانا کو اُن کی بیوی 'زلیخا' کے انتقال کی خبر سُنائی۔ اور جب اُنھوں نے مولانا سے کچھ ہفتے کے لیے باہر چلے جانے کو کہا اور اصرار کیا تو مولانا نے فیصلہ کُن لیکن نرم لہجے میں جواب دیا" میرے بھائی! جو حکومت ہمیں اصلی آزادی دینے کے لیے تیار نہیں اُس سے چند ہفتوں کی آزادی کی بھیک مانگنے سے کیا فائدہ؟" سوچ میں گُم 'ذرا دیر رُک کر وہ بولے "اب ہم اِنشااللہ جنت ہی میں ملیں گے"۔ بعد میں اُنھوں نے لِکھا کہ اگرچہ اِس حادثہ سے وہ بالکل ٹوٹ گئے تھے 'لیکن اُنھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور بہت جلد پُر سکون اور عام دِنوں جیسے لگنے لگے۔ وہ جیل ہی میں تھے کہ اُن کی بڑی بہن کا بھی انتقال ہو گیا۔ اُنھوں نے لکھا" جیل میں میں نے جو وقت گزارا اُس کا زیادہ حصہ بڑی ذہنی اذّیت میں گزرا۔ اِس کا میری صحت پر بہت خراب اثر پڑا۔ جب میں گرفتار ہوا تھا تو میرا وزن 170 پونڈ تھا۔ جب میرا تبادلہ (بنگال میں بنکورا کا) ہوا تو میرا وزن گھٹ کر 130 پونڈ رہ گیا تھا۔ میری بھوک ختم ہو گئی تھی۔

تقاضے

اپنی رہائی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں "ہوڑہ کا اسٹیشن انسانوں کا ایک سمندر لگتا تھا۔ جب ہم روانہ ہونے والے تھے تو میں نے دیکھا کہ میری کار کے سامنے ایک بینڈ بجنے لگا۔ میری رہائی کی خوشی میں۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا اور میں نے کہا کہ خوشی منانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ میرے ہزاروں دوست اور ساتھی اب بھی جیل میں ہیں"۔

راستے میں تین سال پہلے کلکتے سے روانگی کی یادیں اُنھیں آئیں "میری بیوی مجھے الوِداع کہنے دروازے تک آئی تھیں اب میں تین سال بعد لوٹ رہا ہوں لیکن وہ اپنی قبر میں ہیں۔ اور میرا گھر خالی ہے... میری کار پھولوں کے ہاروں سے لدی ہوئی تھی ایک ہار میں نے اُٹھا کر اُن کی قبر پر رکھ دیا اور خاموشی سے فاتحہ پڑھی۔"

سیاست میں ایک بار داخل ہونے کے بعد مولانا نے تمام ذمہ داریوں اور تقاضوں کو خوشی سے پورا کیا۔ تین بار وہ کانگریس کے صدر بنے۔ 1923 میں کانگریس کے سب سے کم عمر صدر بننے کے علاوہ آخری بار اُنھوں نے 1940 سے 1946 تک چھ برس کانگریس کی قیادت کی۔ آزادی سے پہلے یہ صدارت نہ صرف سب سے زیادہ طویل مدّت کی تھی بلکہ یہ ہی زمانہ اُس کی تاریخ میں سب سے مشکل دور بھی تھا۔ مولانا نے لکھا "میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے پھر انکار کیا تو میں گویا اپنے فرائض سے منہ موڑوں گا۔ جب گاندھی جی نے مجھ سے صدر بن جانے کے لیے کہا تو میں فوراً راضی ہو گیا۔"

دوسری عالمی جنگ شروع ہو چکی تھی اور ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ ہمارا ملک اب آزادی کی دہلیز تک آ پہنچا ہے۔ ہمارے ملک کی اِن برسوں کی تاریخ بہت ولولہ انگیز ہے۔

1942 میں کرپس مشن ہندوستان آیا۔ ہندوستان کی آزادی اور لڑائی میں برطانیہ کی امداد کے بارے میں بات کرنے۔ یہ مشن ناکام رہا' ہندوستان چھوڑو' تحریک کے زمانے میں جو 8/ اگست 1942 کو شروع ہوئی تھی۔ ہزاروں مرد اور عورتیں اور سارے بڑے بڑے لیڈر جیل گئے اور مصیبتیں جھیلیں۔ جنگ کے بعد مارچ 1946 میں ایک 'کیبنیٹ مِشن' ہندوستان آیا اُس کی ایک تجویز پر کانگریس نے انتخابات میں حصہ لیا۔ اور مرکزی اور زیادہ تر صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں اکثریت حاصل کی۔

ایک عارضی حکومت بنی۔ مولانا آزاد نے نہ صرف کانگریس کے صدر بلکہ ایک بڑے قومی رہنما کی حیثیت سے بہت محنت سے کام کیا اور دوسروں کے ساتھ مل کر ایک انتہائی مشکل وقت میں ملک کی رہنمائی کی۔ دراصل کانگریس کے لوگ چاہتے تھے کہ اگلی بار پھر وہی کانگریس کے صدر رہیں لیکن اُنھوں نے جواہر لال نہرو کا نام پیش کیا۔ نہرو جی کے الفاظ میں "بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ چاہے وہ صدر رہے ہوں یا صرف ورکنگ کمیٹی کے ممبر' کانگریس کی تاریخ اور ملک کی تاریخ میں 'تجاویز اور پالیسیوں کے مرتّب کرنے میں کتنا اہم رول وہ ادا کرتے رہے۔"

قومی رہنماؤں میں مولانا اپنی ایک اور خوبی کی وجہ سے بھی یاد کیے جاتے تھے۔ جب کبھی کانگریس کے لوگوں میں اختلاف رائے ہوتا تو یہ ہی اُن کو پھر ایک دوسرے سے قریب لاتے۔ کیوں کہ ہر شخص اُن کی عزّت کرتا تھا۔

کئی سال سے مولانا کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی آخری عمر علمی کاموں میں صرف کریں جو اُن کا سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ احمد نگر سے رہا ہونے کے بعد پنڈت نہرو نے بھی اُن سے کہا تھا کہ وہ کانگریس کا کوئی جلسہ ابھی نہ بلائیں۔ کیوں کہ وہ بھی کچھ آرام کر کے اپنی کتاب مکمل کرنا چاہتے تھے لیکن 'مولانا نے لکھا" مجھے اُس وقت معلوم نہ تھا کہ جب ہم رہا کیے جائیں گے تو اپنی باقی ساری عمر ہمارے لیے آرام کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔"

چند دِن بعد ہی جواہر لال اور مولانا دونوں کو شملہ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے جانا پڑا۔ مولانا کا علاج کرنے والے ڈاکٹر کانفرنس کو دو ہفتے کے لیے ملتوی کرانا چاہتے تھے۔ لیکن مولانا راضی نہ ہوئے۔ اُن کی حالت کو دیکھتے ہوئے وائسرائے لارڈ ویول نے اُن کے رہنے کا انتظام قریب ہی کرادیا اور اپنے ذاتی اسٹاف میں سے کچھ کو مولانا کی دیکھ ریکھ کے لیے مقرر کر دیا۔ فرائض کی پابندی کرنے کے بارے میں مولانا نے ایک مرتبہ اپنے دوست کو لکھا تھا"فوجی خدِمات بجالانے سے اِنکار کر دینا کوئی جُرم نہیں ہے۔ لیکن سپاہی بن جانے کے بعد میدانِ جنگ سے بھاگ لینا۔ اِس کی سزا موت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔" وہ یقیناً ہماری جنگِ آزادی کے سب سے بہادر سپاہی تھے۔

آزادی مل گئی

15 اگست 1947 کو ہندوستان آزاد ہوا۔ مہاتما گاندھی ' نہرو ' پٹیل 'مولانا اور دوسرے بڑے رہنماؤں نے دُکھتے دِل سے اِس کا استقبال کیا 'کیوں کہ متحدہ ہندوستان کا اُن کا خواب پورا نہیں ہوا تھا۔ مُلک تقسیم ہو گیا۔ لیکن اطمینان کا سانس لیے بغیر وہ نئے ہندوستان کی تعمیر کے کام میں فوراً جُٹ گئے۔ قوم کے محبوب 'ہمارے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کہا" آدھی رات کا گھنٹہ بجنے پر ہندوستان بیدار ہو گا۔ زندہ اور آزاد۔ اِس سنجیدہ لمحے میں اپنے مُلک اور اُس کے لوگوں کی خدمت میں لگ جانے کا ہم عہد کرتے ہیں۔ بس اب اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے ہمیں محنت کرنی ہے اور کام کرنا ہے"۔

اپنی خراب صحت اور قلم اور کتاب پھر سے اُٹھا لینے کی اپنی خواہش کے باوجود مولانا آزاد نے بھی نئی ذمے داریوں کو منظور کر لیا۔

ہندوستان کے پہلے وزیر برائے تعلیم 'تمدن اور فنونِ لطیفہ کی حیثیت سے وہ ایک ایسی تعلیم کو رائج کرنا چاہتے تھے جو ہندوستانیوں میں ایک نیا ذہن پیدا کر سکے۔ اُنھوں نے نہ صرف اسکول' کالج 'اور یونی ورسٹیاں قائم کیں بلکہ ہندوستان کے عظیم تمدن کو نئی زندگی عطا کرنے کے لیے' ساہتیہ اکاڈمی 'سنگیت ناٹک اکاڈمی' للتِ کلا اکاڈمی اور انڈین کاؤنسل برائے تمدنی تعلقات جیسے اہم ادارے بھی قائم کیے۔

اپنی زندگی کے آخری دن تک وہ جواہر لال نہرو کے قریبی دوست اور ساتھی 'نہرو کے قابل صلاح کار اور سب سے مضبوط حمایت کرنے والے رہے۔

22/ فروری 1958 کو ہماری قومی البم کا ایک رنگین ورق الٹ گیا۔ مختلف لوگ 'ایک مذہبی رہنما 'مصنف (کتاب لکھنے والے) اخبار نویس 'شاعر 'مقرر 'سیاست داں 'اور منتظم کے روپ میں ہندوستان کے اِس عظیم سپوت کو اپنے اپنے طور پر یاد کریں گے۔ لیکن سب سے بڑھ کر مولانا آزاد 'ہندوستان کے اُن لوگوں میں سے تھے جو پکّے مذہبی ہوتے ہوئے بھی ہندوستان کے سچّے سیکولر تمدن کی رہنمائی کرتے رہے۔

سی۔ وی۔ رمن

دلیپ۔ ایم۔ سالوی

"ہمارے پاس بڑے بڑے سائنس داں ہیں۔ اور ہمارے نوجوان بڑھتی ہوئی تعداد میں سائنس کے میدان میں داخل ہو رہے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ان میں سے بہت سے لوگ بڑے ذہین ہیں اور اِن سے ہمیں ہندوستان میں سائنس کے مستقبل کی امیدیں بندھتی ہیں۔ جب کوئی چیز بہت تیزی سے بڑھتی ہے، جیسا کہ سائنس بڑھ رہی ہے، اور غالباً بڑھتی رہے گی، تو اُس کو مناسب شکل اور ایک رُخ دینا ذرا مشکل کام ہو جاتا ہے۔ یہ ہر طرف کو پھیلتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سائنس اور ٹیکنولوجی کے بغیر ہندوستان میں مادّی ترقی کی کوئی پکّی اُمید نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا ہے تو قدرتی طور پر ہمیں سائنس کی ترقی پر۔ سائنسی تحقیقات اور ٹیکنولوجی پر۔ توجہ دینی ہوگی۔ اور اِس طرح سائنس کا مستقبل بھی یقینی ہو جاتا ہے۔ اِس کو مناسب شکل اور رخ دینا، خود سائنس دانوں کا ہی کام ہے۔"

جواہر لال نہرو

سی۔ وی۔ رمن

حال کے کچھ برسوں میں 28ر فروری پورے ملک میں "سائنس کے قومی دِن" کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اُس دِن سائنس داں، عام آدمی اور بچوں کو سائنس ٹیکنولوجی کی نئی ترقیوں کے بارے میں بتاتے ہیں، سائنس اور ٹیکنولوجی کے بارے میں فلمیں، وِیڈیو، اور ٹی۔ وی۔ کے پروگرام دِکھائے جاتے ہیں، سائنس کی ترقی کے بارے میں نمائشیں اور جلسے ہوتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنولوجی میں کچھ اضافہ کرنے کے لیے اعزاز اور انعامات دیے جاتے ہیں۔

سائنس اور ٹیکنولوجی کی ترقیوں کو قوم کے سامنے رکھنے کے لیے خاص اسی دِن کو کیوں چنا گیا ہے؟

کچھ عرصہ پہلے 1928 میں اِس ملک میں، آسان اور سستے سامان کی مدد سے، سائنس کی ایک اہم دریافت کی گئی تھی۔ پوری دنیا نے اِس حقیقت کو جان لیا کہ برطانیہ کا محکوم، سائنس میں پچھڑا ہوا۔ ہندوستان بھی جدید سائنس کے میدان میں ایک بنیادی اضافہ کر سکتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک سنگِ میل تھا کیوں کہ اسی دریافت نے کچھ عرصے بعد ہی دریافت کرنے والے کو 'نوبل انعام' دِلوایا۔ سائنس کی ترقی میں بھی یہ ایک سنگ میل تھا۔

"سائنس کا قومی دِن" ایک یاد دہانی ہے اس تاریخی واقعے کی جس پر ہندوستان کے سب لوگ فخر کرتے ہیں اور آج بھی تعریف اور محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اِس اہم دریافت کو آج رَمن ایفیکٹ (رَمن اثر) کہا جاتا ہے۔ یہ دریافت سی۔ وی۔ رَمن نے کلکتے میں واقع سائنس کی نشو نما کے لیے ہندوستانی ایسوسی ایشن کی لیبوریٹری میں کی تھی۔ وہی تھے جنھوں

نے سائنس کی دنیا کے نقشے پر ہندوستان کو جگہ دلوائی۔ دریافت ہونے کے اتنے سال بعد 'رَمن ایفیکٹ' دنیا بھر کی جدید لیبوریٹریوں میں ٹھوس' رقیق اور گیس کے مطالعے کے لیے ایک نہایت سُتھرے 'طریقے' (ٹول) کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔

سائنس میں دِلچسپی

چندر شیکھر وینکٹا رَمن (سی۔ وی۔ رَمن) 7 ر نومبر 1888 کو تاملِ ناڈو میں ترِوچراپلّی کے قریب پیدا ہوئے۔ اُن کے والِد ایک کالج میں پڑھاتے تھے۔ اُن کی تنخواہ صرف دس روپے تھی۔ اُن کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اور ایک چھوٹی سی لائبریری اُن کے گھر میں تھی۔ اِس لیے چھوٹی عمر سے ہی رَمن کو سائنس اور انگریزی ادب کی کتابیں دیکھنے کو ملیں۔ موسیقی سے اُن کی دلچسپی بچپن ہی سے شروع ہو گئی جو بعد میں اُن کی سائنسی تحقیقات کا موضوع بنی۔ وہ اپنے والِد کو ''وینا'' بجاتے گھنٹوں سنتے رہتے تھے۔

جب اُن کے والد ساحلی شہر وشاکھاپٹنم چلے آئے تو رَمن کا اسکول سمندر کے کنارے تھا۔ جماعت کے کمرے کی کھڑکی سے دور دور تک پھیلا ہوا نیلا سمندر دکھائی دیتا تھا جو بچپن کے تصوّر میں بس رہا اور بعد میں اُن کے مطالعوں کا موضوع بنا۔

بہت چھوٹی عمر سے ہی طبیعات (فزکس) میں اُن کو دلچسپی تھی۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے خود سے ہی بجلی کا ایک ''ڈائنیمو'' بناڈالا۔ ایک اور موقع پر جب وہ بیمار تھے تو جب تک اُن کے والد نے 'لِڈن جار' کے فائدے کا مظاہرہ کر کے اُنھیں سمجھا نہیں دیا' اُنھیں نیند ہی نہیں آئی۔

کلاس میں رَمن ایک نہایت ذہین طالب علم تھے اور انعامات اور وظیفے حاصل کیا کرتے تھے۔ اُن کے استاد اکثر اُن کی انگریزی زبان کی سمجھ' اُن کی آزادی پسند طبیعت اور اُن کے کردار کی پختگی کی تعریف کیا کرتے تھے۔ کچھ تو اُنھیں اپنے سارے طالب علموں میں بہترین بتاتے تھے۔ جب وہ ہائی اسکول کے امتحان میں اوّل آئے تو وہ مشکل سے گیارہ سال کے تھے۔ پریزیڈنسی کالج مدراس میں پہلے دِن ایک یوروپین استاد رَمن کو اپنی کلاس میں بیٹھا دیکھ کر سمجھے کہ وہ شاید غلطی سے اِس کلاس میں آ گئے ہیں۔

جب رَمن ایم۔ اے۔ کر رہے تھے تو وہ کبھی مُشکل سے ہی اپنی کلاس میں جاتے تھے۔

پروفیسر آر۔ایل۔جونس جانتے تھے کہ وہ اپنی پڑھائی خود کر سکتے تھے اور اُنھیں اپنی دلچسپی کے مطابق کام کرنے دیا کرتے تھے۔ رَمن اکثر اوقات کالج کی لیبوریٹری میں سائنسی کھوج میں مصروف رہا کرتے تھے۔ روشنی کی شعاعوں کو ناپنے کے لیے وہ اپنے پروفیسر کے ''فیبری پیروٹ اِنٹرفیرومیٹر' کو استعمال کرتے تھے۔

اپنی اتنی سی عمر میں رَمن کے ذہنی رجحان کا تصور کیجیے جب کہ مُلک میں سائنسی کھوج کو کوئی جانتا تک نہیں تھا۔ کرتے کرتے اُنھوں نے ایک ایسی چیز دریافت کرلی جس کا ذِکر کتابوں میں کہیں نہیں ملتا تھا۔ پروفیسر جونس بھی نہیں سمجھا سکے کہ جو چیز دریافت ہوئی ہے وہ کیا تھی۔ اُنھوں نے رَمن کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی دریافت کو ایک تحقیقی مضمون کی شکل میں لِکھیں اور لندن سے شائع ہونے والے ''دِی فِلاسِفِکل میگزین'' کو بھیج دیں۔ اُن کا مضمون جلد ہی رسالے کے نومبر 1906 کے شمارے میں چھپ گیا۔ یہ سائنس میں رَمن کی پہلی پیش کش تھی۔ وہ اِس وقت صِرف اٹھارہ سال کے تھے۔

جلد ہی اُنھوں نے ایک اور تحقیقی مضمون لکھا اور اُسے لندن کے سائنس کے مشہور رسالے ''نیچر'' کو بھیج دیا۔ اُس وقت تک سائنسی کھوج اپنے آپ کر لینے کا اعتماد اُن میں پیدا ہو گیا تھا۔ رَمن نے اُس زمانے کے سب سے محترم انگریز سائنس داں 'لارڈ ریلے' کو خط لکھ کر اُن سے اپنی سائنسی تفتیشوں کے بارے میں کچھ سوالات کیے۔ لارڈ ریلے نے اپنے جواب میں اُنھیں پروفیسر کہہ کر خطاب کیا۔ یہ تصوّر وہ کیسے کر سکتے تھے کہ بیس سال سے بھی کم عمر کا کوئی لڑکا سائنسی تفتیش کر رہا ہوگا۔

رَمن کے استادوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے اُنھیں انگلستان بھیجنے کے واسطے اُن کے والد کو آمادہ کیا۔ رَمن انگلستان جانے والے جہاز میں سوار ہو گئے ہوتے اور بے شمار دوسرے لوگوں کی طرح وطن کو خیر باد کہہ چکے ہوتے اگر انگریز ڈاکٹر نے اُن کے جانے پر اعتراض نہ کر دیا ہوتا۔ ڈاکٹر کے مطابق اُن کی صحت کمزور تھی اور انگلستان کے موسم کی تھی کہ وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ رَمن کے لیے اب کوئی چارہ ہی نہ تھا سوائے اِس کے کہ وہ مقابلے کے اُس امتحان میں بیٹھیں جو برطانوی حکومت ملازموں کی بھرتی کے لیے ہر سال کرایا کرتی تھی۔ حکومت کے مالیات کے محکمہ میں ایک افسر کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہو گیا۔

تحقیقی کام

رَمن نے سرکاری ملازمت قبول کرلی۔ جہاں اُنھیں اچھّی تنخواہ اور ایک بنگلہ ملا۔ اُن کی شادی لوک سندری سے ہو گئی۔ اِن حالات میں دوسرا کوئی شخص آرام کی زندگی گزارنے لگتا۔ لیکن رَمن سائنس کو کیسے چھوڑ دیتے۔ اِس سے تو اُنھیں عشق تھا۔ اُنھوں نے گھر پر ایک چھوٹی سی لیبوریٹری بنالی اور اپنی دلچسپی کی چیزوں کے بارے میں تفتیش شروع کردی۔ رَمن کی نوجوان بیوی نے تفتیش کے کاموں میں اُن کو مدد دی۔ اور سائنسی کاموں پر پوری توجہ دینے کے لیے اُنھیں آزاد چھوڑ دیا۔ اُنھیں یقین تھا کہ اُنھی کو رَمن کے کام آنا ہے۔ رَمن جو ایک بڑے انسان تھے اُن کی پُشت پر عورت یہ ہی تھیں۔

1907 میں رَمن کا تبادلہ کلکتے کا ہو گیا جو اُن دِنوں ہندوستان میں سائنس کا مَکہ سمجھا جاتا تھا۔ کلکتے آئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ٹرام کار میں گھر سے دفتر جاتے وقت 'بوبازار' کی سڑک پر "سائنس کی نشو و نما کے لیے ہندوستانی ایسوسی ایشن" کا سائن بورڈ اُنھیں نظر پڑا۔ اُسی شام کو جلدی سے وہ ایسوسی ایشن کے دفتر گئے۔ ایسوسی ایشن 'سائنسی تحقیق کے لیے ملک میں سب سے پہلا ادارہ تھا جسے 1876 میں ڈاکٹر مہندر لال سرکار نے قائم کیا تھا۔ کچھ وجوہات کی بنا پر ایسوسی ایشن کی عمارت سائنس سے دل چسپی رکھنے والے لوگوں کے مل بیٹھنے یا کبھی کبھی سائنس کے بارے میں عام دِل چسپی کے لیکچروں کے لیے بھی استعمال کی جارہی تھی۔ ایسوسی ایشن کی لیبوریٹری اور آلات زیادہ تر استعمال ہی نہیں ہوئے تھے۔ جب رَمن نے اس کی لیبوریٹری میں سائنسی تفتیش کرنے کے بارے میں اپنی گہری خواہش کا اظہار کیا تو لیبوریٹری کا سامان اور آلات اُنھیں سونپ دیے گئے۔ اس طرح ایسوسی ایشن کی عمارت میں رَمن کی سائنسی تفتیشیں شروع ہوئیں جو آگے چل کر اُن سے نوبل انعام دِلانے والی دریافت کرا سکی۔

رَمن ایسوسی ایشن کی لیبوریٹری میں روزانہ صبح کو ساڑھے پانچ بجے پہنچ جاتے اور پونے آٹھ بجے واپس آکر دفتر جانے کے لیے تیار ہوتے اور پھر دفتر کے اوقات کے بعد تقریباً پانچ بجے سے دس بجے تک لیبوریٹری میں کام کرتے۔ اتوار کو بھی وہ لیبوریٹری میں رہتے۔ کئی برس اُن کا یہی دستور رہا۔

اُس زمانے میں رَمن کی سائنسی تفتیش زیادہ تر موسیقی کے سازوں کے بارے میں ہی محدود تھی۔ اُنھوں نے پتہ لگایا کہ وینا ،مِردَنگم اور طبلہ جیسے موسیقی کے سازوں سے مترنم آوازیں کیوں نکلتی ہیں۔

اپنی تفتیشوں میں رَمن نے ایسوسی ایشن کے ایک عام ممبر اشوتوش ڈے کی مدد لی۔ اور سائنسی تفتیش کا کام اُنھیں اتنی اچھّی طرح سِکھایا کہ بعد میں اشوتوش ڈے اپنی تفتیش کی اہم دریافتوں کو خود لکھ لیتے تھے جو سائنس کے مشہور رسالوں میں چھپتی تھیں۔ یہ بات اُن لوگوں میں رَمن کے اعتماد کو ظاہر کرتی ہے جو خود کچھ سیکھنا چاہتے ہیں اُن لوگوں کے مقابلے میں جنھیں صرف پڑھایا اور سِکھایا گیا ہو۔ اِس طرح اُنھوں نے جلد ہی نوجوانوں کی ایک ٹیم تیار کرلی جو تفتیش کے اُن کے کاموں میں اُن کے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے ایسوسی ایشن کے ہال میں عام دلچسپی کے سائنسی لکچر دینے شروع کیے تاکہ نوجوانوں کو سائنس کی جدید ترین ترقیوں سے آگاہ کیا جاسکے۔ وہ ایک طریقے سے ملک میں سائنس کے ترجمان بن گئے۔

سائنس کے لیے رَمن کے کاموں نے کلکتہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر شیرِ بنگال' اشوتوش مُکھرجی کو متاثر کیا جنھوں نے حکومت سے درخواست کی کہ رَمن کو اپنے دفتر کے کاموں سے دو سال کی رخصت دے دے تاکہ وہ اپنی سائنسی دلچسپیوں میں پورے وقت کام کرسکیں۔ لیکن حکومت راضی نہیں ہوئی۔ اسی عرصے میں ایسوسی ایشن میں فِزِکس کے لیے 'سرَ کنّاتھ پالِت' کی ایک چیئر' قائم ہوئی۔ یہ جگہ کِسی بڑے سائنس داں کو پیش کی جانی تھی۔ مُکھرجی کی زبردست خواہش تھی کہ یہ چیئر رَمن کو پیش کی جائے۔ لیکن رَمن ایک لازمی شرط کو پورا نہیں کرتے تھے۔ اُنھوں نے مُلک کے باہر کام نہیں کیا تھا۔ مُکھرجی نے رَمن کو مشورہ دیا کہ وہ باہر جاکر کام کر آئیں۔ لیکن سائنس داں نے انکار کردیا اور مُکھرجی سے درخواست کی کہ اگر اُنھیں کی خدمات کی ضرورت ہے تو وہ اِس شرط کو نہ مانیں۔ مُکھرجی اِس پر راضی ہوگئے۔ رَمن اچھّے خاصے پیسوں کی سرکاری ملازمت سے استعفٰی دے کر 1917 میں فِزِکس کی 'پالِت چیئر' پر کام کرنے لگے۔ نوکری چھوڑنے سے اگرچہ اقتدار اور تنخواہ میں کافی کمی آئی لیکن سائنس کے لیے رَمن ہر چیز کو قربان کردینے کے لیے تیار تھے۔

رَمن کی قربانی کو سراہتے ہوئے مُکھرجی نے کہا "یہ ایک واقعہ مجھے یہ آس لگانے کی

ہمت دیتا ہے کہ علم کے مندر میں جس کو تعمیر کرنا ہماری آرزو ہے 'سچ کی تلاش کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔" اِس کے بعد رَمن ایک کُل وقتی سائنس داں ہوگئے۔

پڑھانے کے شوقین

سائنسی تفتیشوں کے ساتھ ساتھ رَمن کو طالب علموں کو بھی پڑھانا ہوتا تھا۔ لیکن اُن کے لیے وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ رات کے کھانے کے بعد بھی وہ اکثر اوقات ایسوسی ایشن کی عمارت میں طالب علموں سے بات چیت کرتے اور سائنسی تفتیشوں میں اُن کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کیا کرتے۔ اُنھوں نے اور مضامین جیسے کہ روشنی' ایکس رے' مقناطیسیت اور کرسٹلز کے بارے میں بھی سائنسی تفتیشیں شروع کردیں۔ اُنھوں نے لیبوریٹری اور اپنی رہائش کے درمیان ایک دروازہ کھلوالیا تاکہ جس کو بھی ضرورت ہو اُن سے آسانی سے مل سکے۔

1921 میں رَمن کو یونی ورسٹیوں کی کانگریس میں بلایا گیا جو انگلستان میں آکسفورڈ میں ہوئی۔ یہ اُن کی عملی زندگی میں ایک موڑ ثابت ہوئی۔ سمندر کے سفر میں عام طور پر ایک تھکا دینے والی یکسانیت ہوتی ہے کیوں کہ سمندر اور آسمان کے علاوہ دیکھنے کو کچھ ہوتا ہی نہیں۔ لیکن رَمن کے لیے یہ سمندر اور آسمان اکتادینے والے نہیں بلکہ سائنسی دلچسپی کا موضوع بن گئے۔ بحرِ روم کی گہری نیلاہٹ خاص طور پر اُن کی توجہ کا مرکز بنی۔ اُنھیں تعجب ہوا کہ یہاں کا پانی اتنا گہرا نیلا کیوں ہے؟

رَمن جانتے تھے کے لارڈ ریلے نے آسمان کی نیلاہٹ کو سورج کی اُن کرنوں کی پیداوار بتایا تھا جنھیں ہوا میں موجود آکسیجن اور نائٹروجن کے مولی کیول (چھوٹے سے چھوٹے قطرے) بکھیر دیتے ہیں۔ لارڈ ریلے نے یہ بھی کہا تھا کہ سمندر کی نیلاہٹ محض نیلے آسمان کا عکس ہوتی ہے۔ لیکن بحر روم کی گہری نیلاہٹ دیکھ کر وہ اِس سادہ جواب سے مطمئن نہ رہ سکے۔ جہاز کے عرشے (اوپر کی چھت) پر کھڑے ہوکر اُنھوں نے تفتیش کرنا طے کیا۔ وہ تیزی سے نیچے اُتر کر اپنے کیبن میں گئے اور ایک چھوٹا سا آلہ لے کر اوپر آئے یہ جانچنے کے لیے کہ سمندر کی گہری نیلاہٹ روشنی کا عکس ہے یا نہیں۔ اُنھیں پتہ چلا کہ گہرا نیلا رنگ تو خود سمندر میں سے آیا ہے۔ خوشی سے کپکپاتے ہوئے انھوں نے طے کیا کہ کلکتے میں اپنی

لیبوریٹری میں اِس بارے میں وہ اپنی تفتیش جاری رکھیں گے۔

جب بھی وہ کوئی قدرتی منظر دیکھتے تو ہمیشہ پوچھا کرتے "ایسا کیوں"؟

یہی ایک سائنس داں کی نشانی ہے۔ لندن میں سیر کے دوران مشہور سرگوشیوں کے برامدوں '(وِھسپرنگ گیلریز) میں بھی اُنھوں نے آسان تجربے کر ڈالے۔

کلکتے واپس پہنچ کر رَمن نے سمندر کے پانی کے مولی کیولوں سے 'اور پھر مختلف رقیق ٹھوس اور گیسوں سے 'روشنی کے رنگوں کے بکھرنے کا مطالعہ شروع کیا۔ کچھ عرصے بعد اُنھیں پتہ چلا کہ سمندر کے نیلے رنگ کی خاص وجہ سمندر کے پانی کے مولی کیولوں کا صِرف نیلی روشنی کو بکھرادینا ہے جب سورج کی روشنی اُن پڑے۔ دھوپ کے باقی سب رنگ جذب ہو جاتے ہیں۔

اِن تفتیشوں کی وجہ سے ساری دنیا میں اُن کی تعریف ہوئی۔ اُنھوں نے ساتھ کام کرنے والوں کی ایک ٹیم بھی بنائی جو خاص طور پر اِنھیں مطالعوں میں لگی رہی۔

سائنس کے اُس میدان میں جسے "آپٹکس" (بینائی یا نگاہ سے متعلق) کہا جاتا ہے 'رَمن کے اہم کاموں کی وجہ سے 1924 میں اُن کو لندن کی رائل سوسائیٹی کا ایک "فیلو" ممبر منتخب کر لیا گیا۔ یہ ایک اعلیٰ اعزاز تھا۔ رَمن کے اعزاز میں دی گئی ایک دعوت میں اشوتوش مُکھر جی نے اُن سے پوچھا "اور اَب اِس کے بعد؟" اُنھیں فوراً جواب ملا۔ "نوبل انعام"۔

اُس دعوت میں شریک بہت سے لوگوں کو یہ جواب ایک کھوکھلا دعویٰ لگا۔ کیوں کہ انگریزوں کے محکوم ملک 'ہندوستان میں سائنس کی ابھی شروعات ہی ہو رہی تھی۔ کوئی خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ ایک ہندوستانی اتنی جلدی 'نوبل انعام' پا سکتا ہے۔ لیکن رمَن اِس بارے میں سنجیدہ تھے۔ "اُمنگ 'ہمّت اور کوشش" اُن کے مطابق کامیابی تک پہنچنے کے گُر تھے۔ نوبل انعام 'حاصل کرنا اُن کی تمنّا تھی 'اپنی سائنسی تحقیقات میں جی جان سے لگ جانے کے لیے وہ تیار تھے۔ بد قسمتی سے مُکھر جی کی زندگی نے وفا نہ کی کہ وہ رَمن کو 'نوبل انعام 'پاتے دیکھ لیتے۔

جب رَمن اور اُن کے شاگرد رقیق اشیا کے 'مولی کیولوں' کے روشنی کو بکھیر دینے کی تحقیق کر رہے تھے تو رَمن افیکٹ' کے کچھ شاہے اُنھیں ملے۔ بینزین جیسے کیمیائی رقیق میں سے 'ایک مہین کٹاؤ سے دھوپ کی ایک کرن گزارنے پر 'ڈائریکٹ وِژن اِسپیکٹرواسکوپ' کی

مدد سے دوسرے کنارے پر روشنی کا بکھراؤ۔ دھنک دِکھائی دیا۔ مہین کٹاؤ سے گزر کر دھوپ کی کرن کی بکھری روشنی (الگ الگ رنگ کی) لکیروں جیسی لگی۔ اور لیجئے اِن لکیروں کے علاوہ رمن اور اُن کے شاگردوں نے دھنگ میں غیر معمولی کچھ ار لکیریں بھی دیکھیں۔ وہ سمجھے کہ کیمیائی رقیق کے صاف نہ ہونے کی وجہ سے یہ عجیب سی لکیریں دکھائی دے رہی ہیں۔ کیمائی رقیق کو انھوں نے کتنا بھی صاف کیا مگر یہ لکیریں موجود رہیں۔ دوسرے کیمیائی رقیقوں میں بھی یہ لیکریں دیکھی گئیں۔

کئی برس تک انھیں خطوط پر تفتیش جاری رہی۔ لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکل پایا۔ رَمن حیران تھے کہ یہ ہیں کیا؟ ایک بار اُنھیں یہ خیال ہوا کہ شاید روشنی کے ذرّوں کی وجہ سے ایسا ہوتا ہو جن کا اُن دنوں چرچا تھا۔ جدید فزکس کا وہ ابتدائی زمانہ تھا۔ ایک نیا نظریہ یہ تھا کہ روشنی ایک لہر اور ایک ذرّے کی شکل میں بھی چلتی ہے۔

رَمن ایفیکٹ

1927 میں فزکس میں نوبل پرائز 'یو۔ ایس۔ اے۔ کی شکاگو یونی ورسٹی کے اے۔ ایچ کامپٹن کو اُن کی کامپٹن ایفیکٹ' کی دریافت پر ملا۔ کامپٹن ایفیکٹ' میں کسی مادّے میں سے 'ایکس ریز' کے گزرنے پر غیر معمولی لائنیں دیکھی گئیں۔

'ایکس ریز' نام کی شعاعوں کی ذرّاتی نوعیت کی وجہ سے کامپٹن ایفیکٹ' پیدا ہوتا ہے۔ رَمن نے صحیح سمجھا کہ اِس کے تجربات میں بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔

روشنی کی کرن ذرّات (فوٹو) کی ایک دھارا کی طرح ہے۔ 'فوٹون' کیمیائی رقیق کے مولی کیولوں سے ٹکراتے ہیں' جیسے کوئی کرکٹ کی گیند کسی فٹ بال سے ٹکرائے۔ کرکٹ کی گیند زور سے فٹ بال پر لگی لیکن وہ فٹ بال کو بس ذرا سا ہی کھِسکا سکی۔ کرکٹ کی بال ٹکرا کر خود دوسری طرف کو لڑھک گئی لیکن پہلے سے کچھ کم زور کے ساتھ کیوں کہ اُس کا کچھ زور فٹ بال نے لے لیا تھا۔ یہ غیر معمولی لکیریں اِس وجہ سے بنیں کہ کچھ فوٹون اپنا زور کھو کر بکھری روشنی یا دھنک میں 'مختلف مقامات پر ہوتے ہیں۔ جب کہ باقی فوٹون اپنے راستے پر 'ذرا سا خم کھا کر 'بغیر اپنا زور کھوئے یا بڑھائے چلتے رہتے ہیں۔ اور دھنک یا قوس میں اپنی جگہ پر رہتے ہیں۔

فوٹون کے زور میں کمی آجانا اور اُس کی وجہ سے غیر معمولی لکیروں کا دکھائی دینا 'رَمن اثر' کہلاتا ہے۔

فوٹون کے زور میں کمی کی مقدار اُس کیمیائی رقیق کے مولی کیولوں کو بتاتی ہے جنھوں نے فوٹون کو بکھیر دیا تھا۔ مختلف طرح کے مولی کیول فوٹون کا زور مختلف مقدار میں گھٹاتے ہیں۔ جس طرح کرکٹ کی بال کے ٹینس کی بال، گولف کی بال یا فٹ بال سے ٹکرانے سے ہوتا ہے۔ غیر معمولی لکیروں سے فوٹون کے زور میں آئی کمی کو ناپ کر 'رقیق' ٹھوس یا گیسوں کے اندر مولی کیولوں کی ترتیب معلوم کی جاسکتی ہے۔ اِس طرح 'رَمن ایفیکٹ' مادّے کی بناوٹ کو سمجھنے میں کام آتا ہے۔ رَمن اور اُس کے شاگردوں نے اس طریقے سے معلوم کر کے بتایا کہ نگاہ کے مختلف شیشوں 'مختلف چیزوں کے بنے کرِسٹلز' جواہرات 'موتیوں 'ہیروں اور کوارٹز میں 'رقیق مرکب' جیسے بینزین 'ٹولوین' پینین میں اور دبائی ہوئی گیسوں جیسے کاربن ڈائی آکسائیڈ اور نیٹرس آکسائیڈ میں مولی کیول کس ترتیب میں ہوتے ہیں۔

اپنی دریافت کا اعلان کرنے سے پہلے رَمن اُس کی سچائی کو یقینی بنانا چاہتے تھے۔ غیر معمولی لکیروں کو زیادہ صاف طور پر دیکھنے کے لیے اُنھوں نے دھوپ کے بجائے پارے کی گیس کا لیمپ (مرکری وَیپر لیمپ) استعمال کر کے دیکھا۔ وہ لکیریں واقعی زیادہ واضح ہو گئیں۔ اب نئی دریافت کی دُرستی کا اُنھیں یقین ہو گیا۔ یہ بات 28/ فروری 1928 کی ہے۔ اگلے دِن اُنھوں نے غیر ملکی اخباروں کے نمائندوں کو بُلا کر اِس کا اعلان کر دیا۔ مؤقّر (جودِ قار رکھتا ہو یعنی جس کا احترام کیا جاتا ہو) رِسالے ''نیچر'' نے اِس کو شائع کیا۔

16 مارچ کو رَمن نے بنگلور میں 'جنوبی ہند کی سائنس ایسوسی ایشن' کے سامنے اپنی دریافت نئی ضو (روشنی) کے بارے میں بتایا۔ اِس اثر (ایفیکٹ) کی تائید سب سے پہلے یو۔ ایس۔ اے کی 'جان ہاپکن' یونی ورسٹی کے آر۔ ڈبلیو۔ ووڈ نے کی۔ جلد ہی دنیا کی تمام بڑی لیبوریٹریوں نے 'رَمن اثر' کی تحقیق شروع کی۔ نئی اُبھرتی ہوئی جدید فزکس کو اس سے مزید تقویت ملی۔

نوبل انعام

رَمن اثر' کی مقبولیت اور اِفادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ دریافت کے دس

سال کے اندر اندر دنیا بھر میں دو ہزار تحقیقی مضامین اُس کے بارے میں شائع ہوئے۔ اِس کا زیادہ تر استعمال مختلف ٹھوس، رقیق اور گیس کی شکل رکھنے والی چیزوں کے اندر مولی کیولی ڈھانچے کو پہچاننے کے لیے کیا گیا۔

رَمن کو بہت اعزاز ملے۔ وہ صرف 42 سال کے تھے۔ نوبل انعام پانے کا اُنھیں اتنا یقین تھا کہ دسمبر 1930 میں انعامات کا اعلان ہونے سے چند مہینے پہلے ہی اُنھوں نے اسٹاک ہام کے لیے دو سیٹیں بُک کرا لیں۔

رَمن پہلے ایشیائی اور غیر سفید شخص تھے جنھوں نے سائنس میں 'نوبل انعام جیتا' ہر ہندوستانی کے لیے یہ بڑے فخر کا لمحہ تھا۔ اس واقعہ نے دِکھا دیا کہ سائنس کے میدان میں ہندوستانی یوروپ والوں سے کسی طرح پیچھے نہیں تھے جو اُس زمانے میں اُن کا ہی میدان سمجھا جاتا تھا۔

اس سے پہلے 1913 میں رابندر ناتھ ٹیگور نے ''ادب'' کا نوبل انعام حاصل کیا تھا۔

'نوبل انعام' کے بعد رَمن کو دنیا کے مختلف حصّوں سے دوسرے کئی مؤقر انعامات ملے۔

ان سب کی وجہ سے ہندوستان میں سائنس کی اہمیت اور حیثیت میں اضافہ ہوا۔ یہ کارنامہ واقعی تاریخی تھا آزادی سے پہلے کے اُس زمانے میں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو سائنس پڑھنے کا شوق ہوا۔

1933 میں رَمن کو بنگلور کے 'اِنڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس' کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا' جو ملک میں سائنس کے شروع کے اداروں میں سے ایک تھا۔ یہاں اُنھوں نے فزکس کا نیا شعبہ قائم کیا' جو پہلے نہیں تھا۔ اُنھوں نے سائنسی تحقیقات کرنے کے لیے نوجوان سائنس دانوں کی ایک ٹیم پھر بنانی شروع کی۔ اور اِنسٹی ٹیوٹ کے قاعدے قانون میں تبدیلیاں کیں تاکہ سائنس داں دنیاوی ضروریات میں اُلجھے بغیر اپنی تحقیقات میں اطمینان سے لگے رہیں۔ کبھی کبھی تحقیقات کو تیزی سے کرانے کے لیے وہ اپنی جیب سے بھی پیسے دے دیا کرتے تھے۔

کچھ عرصے بعد رَمن نے سائنسوں کی ہندوستانی اکیڈمی قائم کی۔ اور ایسے سائنس دانوں کو اُس کے فیلو چُنا جو اپنے کام سے نام پیدا کر چکے تھے۔ اکیڈمی کے سالانہ جلسے مختلف قصبوں اور شہروں میں ہوتے تھے تاکہ دلچسپی رکھنے والے مقامی نوجوان اُن میں شرکت کر سکیں اور سائنس دانوں کے ساتھ بات چیت کر سکیں۔ رَمن کے نزدیک نوجوانوں کو

سائنس سے دلچسپی پیدا کرانے کا یہ بھی ایک طریقہ تھا۔ سائنس میں ہونے والی نئی سے نئی ترقی کے بارے میں وہ عام لوگوں کے لیے خود بھی لکچر دیا کرتے تھے اور نوجوانوں کو سائنسی تحقیقات کرنے کے لیے اُبھارا کرتے تھے۔ وہ یہ بھی کوشش کرتے تھے کہ نوجوان سائنس دانوں کو ملک کی یونی ورسٹیوں اور اداروں میں مناسب جگہیں اور عہدے ملیں۔

رَمن کو ہر وقت یہی فکر رہتی کہ ہندوستان میں سائنس کی تحریک کیسے شروع ہو سکتی ہے۔ وہ ہمیشہ اِس بارے میں مناسب موقعوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایسا ایک موقع اُس وقت آیا جب جرمنی میں یہودی سائنس دانوں پر ہٹلر کی نازی حکومت نے ظلم توڑنے شروع کیے اور وہ دوسرے ملکوں میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔ رَمن نے فزکس کے کچھ چوٹی کے ماہر سائنس دانوں، جیسے 'میکس بورن' اِروِن شرڈِنگر وغیرہ کو یہاں آکر آباد ہو جانے کی دعوت دی تاکہ اُن کی صرف موجودگی سے ہی سائنس تحقیقات کو بڑھاوا مِل سکے۔ لیکن رَمن کی اِس دور اندیشی کو اِنڈین اِنسٹی ٹیوٹ آف سائنس کے منتظم نہ سراہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رَمن نے ڈائریکٹر کا عہدہ چھوڑ دیا۔ انتظامیہ کی یہ تنگ نظری افسوس ناک تھی کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ کِس طرح سائنس نے سرحدوں کا خیال کیے بغیر ملکوں کو آگے بڑھایا اور انسانوں کی ترقّی میں مدد دی ہے۔ استعفےٰ دینے کے فوراً بعد رَمن کو ہالینڈ کے ایک مشہور سائنسی ادارے کی ڈائریکٹر شپ پیش کی گئی جس کو اُنھوں نے نامنظور کر دیا۔ کیوں کہ وہ اپنے ملک میں ہی رَہ کر یہاں سائنس کی بنیاد تیار کرنا چاہتے تھے۔

رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ (تحقیقی ادارہ)

1948 میں رَمن کا خود اپنا ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کا خواب پورا ہوا۔ جو بنگلور میں رَمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ' کہلایا۔ اُنھوں نے خود اپنی جمع پونجی اکھٹی کی۔ چندے مانگے' اور کچھ صنعتیں بھی قائم کیں تاکہ انسٹی ٹیوٹ کو چلانے کے لیے ایک رقم پابندی کے ساتھ ملتی رہے۔

یہ ادارہ اپنی صفائی' ستھرائی' اور خوبصورتی میں رَمن کی پسند کے مطابق تھا۔ کھِلے ہوئے بوگن ویلیا' جیکرانڈا اور گلابوں سے وہ چمن سا لگتا تھا جس میں یوکلپٹس سے لے کر مہوگنی تک کے طرح طرح کے پیڑ بھی لگے ہوئے تھے۔ یہاں رَمن اپنی پسند کے موضوعات پر سائنسی

تحقیقات کرتے رہتے تھے۔ ہر جگمگاتی اور چمکتی ہوئی چیز رمن کی تحقیقات کا موضوع بن جاتی۔ اُنھوں نے لگ بھگ تین سو ہیرے خریدے جو سب سے زیادہ ٹھوس ہوتے ہیں اور اُن کی اندرونی ساخت اور باہر کی خصوصیات کا مطالعہ کیا۔ چڑیوں کے رنگین پر، تتلیوں، بھونروں اور پھولوں کی پنکھڑیوں پر بھی اُن کی نظر گئی اور اُنھوں نے تحقیق کی کہ وہ اتنے رنگین کیوں ہیں؟ اِن مطالعوں کے بعد اُنھوں نے "نگاہ اور رنگ" کے بارے میں ایک نظریہ پیش کیا اور اپنی تحقیقات کو 'نِگاہ کی فزیالوجی' (فزیالوجی آف وِژن) نام کی اپنی کتاب میں درج کیا۔ یہ مضمون حال ہی میں سائنس دانوں کی توجّہ کا مرکز بنا ہے۔

مغرب میں ہونے والی تفتیشوں سے ہٹ کر تفتیش کی نئی راہیں کھوج نکالنا اُنھیں خوب آتا تھا۔

1947 میں ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے بعد رَمن کو مایوسی ہوئی کہ خود ملک میں سائنس کو اُبھارنے کے لیے کوئی کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ جِس کے لیے وہ ہمیشہ سے کوشش کرتے رہے تھے۔ اِس کے بجائے سائنس دانوں کو بڑی تعداد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے دوسرے ملکوں میں بھیجا جا رہا تھا۔ سائنسی تفتیشوں کے لیے خود ملک میں کافی اِمکان تھا اور اِس کے لیے ضروری سہولیات مہیا کرنا ہمارا فرض تھا۔ ہمیں اندر کی طرف دیکھنے کی ضرورت تھی۔

نوجوان سائنس دانوں کے لیے ایک مثال قائم کرنے کے واسطے' تاکہ وہ باہر کے ملکوں کی ڈگریوں اور اعزازات کے پیچھے نہ بھاگیں۔ اُنھوں نے 'رائل سوسائٹی لندن' کی فیلوشِپ سے استعفےٰ دے دیا۔ سائنس کی سیاست زدگی سے اُنھیں نفرت ہونے لگی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ سیاست اور سائنس مشکل ہی سے ساتھ چل سکتی ہیں۔ اس سے سائنس کو ہی نقصان پہنچتا ہے اور اُس کی ترقی رُک جاتی ہے۔ جب اُنھیں ہندوستان کا نائب صدر بنانے کی بات چلی' جو ایک بڑا اعزاز تھا' تو انھوں نے ایک لمحہ سوچے بغیر انکار کر دیا۔ 1954 میں وہ پہلے سائنس داں تھے جنھیں 'بھارت رتن' کا خطاب مِلا جو بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔

ایک صاحبِ نظر

کئی برس تک رَمن سب سے الگ تھلگ رہے۔ لیکن بے چینی تو رَمن کی زندگی کی

علامت تھی۔ بچوں کی صحبت میں وہ خوب خوش رہتے۔ وہ اسکول کے بچوں کو انسٹی ٹیوٹ میں بُلاتے اور گھنٹوں اُنھیں انسٹی ٹیوٹ کی سیر کراتے۔ وہ بڑے صبر کے ساتھ بچوں کو سمجھاتے کہ اُن کے آلے کس طرح اور کیا کام کرتے ہیں اور یہ کہ وہ کیا اور کیسے تفتیش کر رہے ہیں۔ وہ خود اسکولوں میں جاتے اور سائنس میں لیکچر دیتے۔ وہ اکثر بچوں سے کہتے کہ سائنس کو لیبوریٹری میں نہیں بلکہ کھلی دنیا میں تلاش کرنا چاہیے۔ اُنھیں ستاروں، پھولوں اور آس پاس موجود دوسرے مظاہر کو دیکھنا چاہیے۔ اُن کے بارے میں سوال پوچھنے چاہئیں۔ اور اپنے ذہن اور سائنس سے اُن کے جواب معلوم کرنے چاہئیں۔

آج کے بہت سے سائنس دانوں نے اُن کے لکچر سُن کر ہی سائنس پڑھی۔ وہ صحیح معنوں میں صبح کی خبر دینے والے تھے۔

چندر شیکھر وینکٹا رمن نے اتنی عمر پائی کہ وہ دنیا کی جدید لیبوریٹریوں کو پھر سے 'رَمن ایفیکٹ' میں دلچسپی لیتے دیکھ سکے جو 1960 میں 'لیزر' کی ایجاد کے بعد شروع ہوئی۔ 'لیزر' ایک بہت ہی گتھی ہوئی اور تیز روشنی ہے۔ اس سے پہلے 'رَمن ایفیکٹ' کی ایک صاف تصویر حاصل کرنے میں کئی دِن لگا کرتے تھے 'لیزر' کی مدد سے وہی کام چند سیکنڈ میں ہو جاتا ہے۔ چناں چہ 'رمن ایفیکٹ' کا استعمال اب مختلف میدانوں میں ہو تا جا رہا ہے مثال کے طور پر کیمیائی صنعتوں میں 'آلودگی (پولیوشن) کے مطالعوں میں 'دوا سازی کی صنعتوں میں' بیالوجیکل مطالعوں میں اُن کیمکلز کا جائزہ لینے میں جو بہت ہی کم مقدار میں ہوتے ہیں۔ یہ اُن چیزوں کے بارے میں بھی اطلاعات فراہم کر سکتا ہے جن کا اُس وقت کسی کو خیال بھی نہیں تھا جب رَمن نے اِس اثر (ایفیکٹ) کو دیافت کیا تھا۔

21 / نومبر 1970 کو 82 سال کی عمر میں مختصر علالت کے بعد سی۔ وی۔ رَمن دنیا سے گزر گئے۔

رَمن پہلے شخص تھے جنھوں نے جدید سائنسی دنیا میں ہندوستان کا نام شاملِ کرایا۔ سی۔ وی۔ رَمن نے ایک بھولے ہوئے راستے کا پتہ لگایا اور جن اصولوں کا اُنھوں نے اعلان کیا وہ اُس راستے کو روشن کرنے والے تھے جن پر چل کر آزاد ہندوستان ترقی اور توانائی (قوّت) حاصل کر سکتا ہے۔ ہندوستان میں سائنس کو پھر سے پالینے اور آگے بڑھانے میں رَمن نے جو کام انجام دیا وہ بے حد و حساب ہے۔

"ہمارے نوجوان یونی ورسٹیوں میں آتے ہیں اور اُن سے نکل کر دُنیا کا سامنا کرتے ہیں... اُس دُنیا کا جو غیر ہمدرد اور سخت گیر معلوم ہوتی ہے۔ میں نوجوان مَردوں اور عورتوں سے کہنا چاہوں گا کہ وہ امید اور ہمت کو نہ چھوڑیں۔ کام میں پوری ہمت کے ساتھ لگے رہنے سے ہی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ دنیا میں کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں اگر اُس کے حاصِل کرنے میں ہمارے ماتھے سے پسینہ نہ ٹپکا ہو۔ ہندوستان میں ہمارے پاس انسانوں کی کمی نہیں۔ 24 سال کا تجربہ رکھنے والے ایک استاد کی حیثیت سے میں بلا خوفِ تردید یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اپنی خوبی میں ہندوستانی دماغ کسی بھی "ٹیوٹونِک 'نورڈِک 'یا اینگلو سیکسَن' دماغ جیسا ہی ہے۔ ہم میں جو کمی ہے وہ شاید ہمت کی ہے۔ ہم میں کمی آگے بڑھنے کی اُس قوت کی ہے جو کسی کو کہیں بھی لے جا سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں ہم میں احساسِ کمتری پیدا ہو گیا ہے۔ آج ہندوستان میں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہار جانے کے اِس ڈر کو کچل ڈالنے کی ہے۔ ہمیں جیتنے کا حوصلہ چاہیے۔ وہ حوصلہ اور جذبہ جو ہمیں آسمان کے نیچے ہمارے صحیح مقام تک پہنچا سکتا ہے۔ وہ جذبہ جو یہ مانے گا کہ ایک قابلِ فخر تہذیب کے وارِث کے ناطے اِس کرۂ ارض پر صحیح جگہ پانے کا ہمیں بھی حق ہے۔ اگر ہار نہ ماننے والا یہ جذبہ جاگ جائے تو اپنا صحیح مقدر حاصل کرنے سے ہمیں کوئی چیز نہیں روک سکتی"۔

سی۔ وی۔ رَمن

کملا نہرو

جوہی سنہا

"مجھے اپنی شادی کے شروع کے برسوں کا خیال آیا جب کملا کو بہت چاہنے کے باوجود میں اُس کو تقریباً بھول سا گیا۔ اور میں اُس کو وہ رفاقت نہ دے سکا جو اُس کا حق تھا۔ پھر بھی میں اُس کو بھول کہاں پاتا؟
سکون پانے کے یقین کے ساتھ میں بار بار اُسی کے پاس آتا۔ اُس نے جو مجھے دیا میں نے اُس سے لیا۔ لیکن اِن شروع کے برسوں میں میں نے بدلے میں اُسے کیا دیا؟ ظاہر ہے کہ کچھ بھی نہیں۔ اور شاید اُن دِنوں کے گہرے اثرات اُس کے دِل سے مٹے نہیں۔ اپنی انتہائی غیرت مند اور حساس طبیعت کی وجہ سے اُس نے مدد مانگنے کے لیے میرے پاس آنا کبھی پسند نہیں کیا۔ اگرچہ میں ہی کسی اور سے زیادہ اُسے یہ مدد دے سکتا تھا۔ قومی جدوجہد میں وہ خود بھی اپنا حصّہ ادا کرنا چاہتی تھی نہ کہ محض اپنے شوہر کی پرچھائیں کے طور پر یا اُس کے ساتھ ساتھ لگے رہنے کی وجہ سے ... ایسا لگتا کہ ٹیگور کے ڈرامے کی 'چترا' کی طرح وہ مجھ سے کہہ رہی ہو "میں چترا ہوں کوئی دیوی نہیں جسے پوجا جائے اور نہ قابلِ رحم ہوں جیسے کیڑا سمجھ کر بے توجہی کے ساتھ ایک طرف کر دیا جائے۔ اگر جرأت اور خطرے کے راستے پر تم مجھے اپنے ساتھ لے چلنے کے لیے راضی ہو۔ اگر تم اپنی زندگی کے اہم فرائض میں مجھے حصّہ لینے دو۔ تب تمھیں میری اصلیت معلوم ہو گی"۔
اُس نے مجھ سے اپنی زبان سے یہ سب نہیں کہا۔ صرف رفتہ رفتہ ہی میں اُس کی آنکھوں کے اِس پیغام کو پڑھ سکا"

جواہر لال نہرو

کملا نہرو

پُرانی دہلی کے 'بازار سیتارام کی ایک گلی میں' ایک مکان ہے' جو کبھی اَٹل گھرانے کے بزرگ پنڈت کشن لال کا گھر تھا۔ یہاں یکم اگست 1899 کو پنڈت کشن لال کے پانچویں بیٹے 'جواہر لال' اور اُن کی بیوی 'راج پتی' کے ایک بیٹی 'کملا' پیدا ہوئی۔ یہ اُن کی پہلی اولاد تھی۔ اَٹل نِواس کے بڑے بڑے کمروں اور صحنوں میں وہ اپنے بھائی 'چاند' اور کیلاش' کے ساتھ پلی بڑھی۔ اُس کی بہن 'رُپّی' کئی سال بعد پیدا ہوئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب لڑکوں کو تو پڑھنے کے لیے باہر بھیجا جاتا تھا اور لڑکیوں کو پنڈت گھر میں آکر پڑھایا کرتے تھے۔ لڑکیوں کو سخت پردے میں رکھا جاتا تھا۔ ننھی کملا جان گئی تھی کہ اُس کے بھائیوں کو کہیں کو زیادہ آزادی دی جاتی ہے۔ اِس لیے' وہ بھی اکثر اپنے بھائیوں کے کپڑے پہن لیتی تاکہ وہ بھی بھائیوں کے ساتھ باہر جاکر کھیل سکے (برسوں بعد جب اُس کی اپنی بیٹی پیدا ہوئی تو کملا اُس کو بھی لڑکوں کے کپڑے پہناتی تھی) بچی کملا کے لیے' پردے کے خلاف اور لڑکے لڑکیوں کے ساتھ سلوک میں فرق کے خلاف' زندگی بھر کی اپنی جدّو جہد کی' یہ ابتدا تھی۔

جس زمانے میں 'کملا' پرانے رسم و رواج کے سخت پابند' کشمیری برہمن گھرانے کے الگ تھلگ ماحول میں پرورش پارہی تھی تو ملک میں تہلکہ مچا دینے والے واقعات ہو رہے تھے۔ 1899 میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے وہ قحط پڑا جو لوگوں نے سو سال میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ غریبوں کی انتہائی مصیبت پر انگریز حاکموں کی بے توجہی نے غصّے اور ناراضگی کا

ماحول پیدا کر دیا۔ 1905 میں بنگال کی تقسیم نے غصے کے اِن جذبات کو اور ہوا دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1906 میں کانگریس نے کلکتے میں ہونے والے اپنے اجلاس میں سوراجیہ کی مانگ کی۔

شادی

اُس زمانے میں لڑکیوں کی شادی بزرگ طے کیا کرتے تھے۔ منگنی اور شادی کی رسومات وہ موقعے ہوتے تھے جن میں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو دیکھا اور دِکھایا جاتا تھا اور جہاں الدین اپنے ہونے والی بہوؤں اور دامادوں کو تلاش کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک تقریب میں اِلہ آباد کے مشہور وکیل پنڈت موتی لال نہرو 'کی نظر 'کملا' پر پڑی۔ اُن کا اِکلوتا بیٹا جواہر لال انگلستان میں پڑھ رہا تھا اور اگرچہ کملا کی عمر ابھی تیرہ سال کی ہی تھی دونوں خاندانوں میں شادی کی بات چیت شروع ہو گئی۔ موتی لال لڑکی کی خوبصورتی اور ذہانت سے بہت متاثر ہوئے۔ اور کملا کا ایک فوٹو اپنے بیٹے کو بھیج دیا۔ جواہر لال کو فوٹو پسند آیا۔ انگلستان سے واپس آنے پر جب اُنھوں نے پہلی مرتبہ کملا کو دیکھا تو وہ سولہ سال کی تھیں۔ اور جواہر لال کی سب سے چھوٹی بہن 'کرشنا' کے مطابق ''بہت پیاری'' اور ''اپنی دیکھی ہوئی اِنتہائی حسین عورتوں میں سے ایک لگیں"۔

حسین کملا اور موتی لال کے بہت پڑھے لکھے خوب صورت بیٹے جواہر لال کی پریوں کی کہانیوں جیسی شادی بہت دھوم دھام سے 8 / فروری 1916 کو ہوئی۔ نہرو خاندان کی رئیسانہ اور بڑے ٹھاٹھ باٹ کی زندگی سے کملا کا یہ پہلا سابقہ تھا۔ زندگی 'ملاقاتوں اور دعوتوں کا ایک سلسلہ تھی۔ پھر خاندان چھٹی منانے کشمیر چلا گیا۔ ایک مہینے بعد یہ جوڑا پھر اِلہ آباد 'آنند بھون میں واپس آیا۔ اور کملا کی زندگی کملا نہرو کی حیثیت سے باقاعدہ شروع ہوئی۔

آنند بھون میں شروع کے سال کملا کے لیے آسان نہیں تھے۔ نہرو خاندان میں جواہر لال اور کملا کے علاوہ 'جواہر لال کے والدین اور دو چھوٹی بہنیں 'سروپ' اور 'کرشنا' تھیں اگرچہ کملا کے سُسر ہمیشہ اُس کا لاڈ کرتے لیکن اُس کے طور طریقے خاندان کے باقی لوگوں سے اتنے مختلف تھے کہ چھوٹے موٹے اختلافات اور غلط فہمیاں اکثر ہو ہی جاتی تھیں۔ خاص

کرسروپ سے جو شادی کے بعد وِجے لکشمی پنڈت کہلائیں۔

حسّاس

جواہر لال نہرو کملا سے دس سال بڑے تھے۔ عمر کے اِس فرق کے علاوہ کئی سال باہر گزارنے کی وجہ سے نوجوان میاں بیوی میں ایک جیسی سوچ سمجھ کا پیدا ہو جانا اور بھی مشکل ہو گیا۔ اپنی روائتی انداز کی ہندوستانی پرورش اور اپنے شوہر کے خاندان کی 'مغربی رہائش کی وجہ سے کملا اکثر آنند بھون میں اپنے کو اجنبی محسوس کرتیں۔ وہ ایک ذہین اور حسّاس 'کم عمر خاتون تھیں جو زندگی کے اوپری انداز اور فیشن سے 'خاص طور پر جو دیس پر حکومت کرنے والے بدیسیوں کی نقل میں اپنایا گیا ہو' مشکل سے متاثر ہوتی تھیں۔

19 رنومبر 1017 کو کملا اور جواہر لال کے ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ اُنھوں نے اُس کا نام 'اندرا پریہ درشنی' رکھا۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد کملا کی صحت خراب رہنے لگی۔

اُس زمانے میں جواہر لال گاندھی جی کے اثر میں زیادہ آتے جا رہے تھے۔ اگر وہ سوِل نافرمانی کی تحریک میں اُس وقت نہیں کود پڑے تو صِرف اس لیے کہ اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے وہ اپنے والِد کی مرضی کے خلاف کچھ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نہرو گھرانے میں زوردار بحث و تکرار روز کی بات ہو گئی۔

اپنے خاموش انداز میں 'کملا' ذاتی قربانی کے لیے گاندھی جی کی پُکار کی دِل سے تائید کرتی تھیں۔ جب جواہر لال نے خود کو گھر میں ایک طوفان میں گھِرا دیکھا تو ایک اُن کی بیوی تھیں جو طاقت کا ایک ستون بنی اُن کے ساتھ کھڑی رہیں۔ آخر کار موتی لال ڈھیلے پڑے۔ اگرچہ اپنے پیارے بیٹے کے جیل جانے کا خیال اُن کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ لیکن جب اُنھوں نے گاندھی جی کا ساتھ دینا طے کیا تو بھرپور ساتھ دیا۔

یک تبدیلی

13/ اپریل 1919 کو ہونے والے المناک واقعے نے سارے ملک کو ہلا دیا۔ اور لوگ

غصّے سے نکھر گئے۔ اگر آزادی کی تحریک میں شاملِ ہونے کے لیے جواہر لال کے ارادے کو اور پکّا کردینے کی ضرورت تھی تو جلیانوالے باغ کے قتلِ عام سے وہ کمی بھی پوری ہوگئی۔ نہرو خاندان سے مغربیت کی اوپری چمک دمک اُتری اور اُس کی جگہ مکمل ہندوستانی طرزِ زندگی نے لے لی۔ کملا کے لیے یہ تبدیلی اپنے اصل کی طرف لوٹنے کی تھی۔ کملا اپنی سسرال کی عیش و آرام اور رئیسانہ زندگی میں کبھی سکھی نہیں رہیں۔ اُنھوں نے بڑی خوشی سے قیمتی ریشمی لباس اور ریاست دکھانے والی دوسری چیزوں کو چھوڑ کر کھادی کا لباس اور سادہ زندگی اختیار کی۔ اِس تبدیلی نے اُنھیں اور جواہر لال کو زیادہ قریب کردیا۔ اور اُن دونوں کی پرورش کے انداز میں جو بڑا فرق تھا اُس کا اثر بھی کم ہونے لگا۔

لیکن یہ عجیب اتفاق تھا کہ آزادی کی تحریک نے ایک طرف جواہر لال اور کملا کو ایک دوسرے سے قریب کیا تو دوسری طرف اُن کا ساتھ ساتھ رہنا بھی ختم کرادیا۔ کیوں کہ اب باپ بیٹے دونوں کے جیل جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جیسے جیسے قومی تحریک میں اِن کی شرکت بڑھی، خاندان کو بہت مشکلیں پیش آنے لگیں۔ پیسے کی اکثر کمی رہنے لگی۔ جواہر لال کی اپنی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اور اگر چہ یہ تجویز بھی سامنے آئی کہ کانگریس کے ایک جنرل سکریٹری کی حیثیت سے جواہر لال کو تنخواہ دی جائے لیکن موتی لال نے اُس کی مخالفت کی۔ عوام کے چندے کو تنخواہوں پر خرچ کرنے کو وہ غلط سمجھتے تھے۔ اِس طرح اُس چھوٹی سی رقم کے علاوہ جو کچھ کمپنیوں کے حصّوں (شیرز) سے منافع کے طور پر اُنھیں ملتی تھی۔ جواہر لال اپنے اخراجات کے لیے اپنے والِد ہی کے دست نگیر رہتے تھے۔ یہ صورتِ حال جب خود جواہر لال کے لیے اچھی نہیں تھی تو اُن کی بیوی کے لیے تو اور بھی زیادہ تکلیف دہ تھی۔ انھوں نے اپنی شادی کے شروع کے برسوں میں اپنے آپ کو بہت سی چیزوں سے محروم رکھا تھا۔ اب اُنھوں نے اپنی ضروریات اور بھی کم کردیں۔ لیکن پھر بھی دُوسروں کو دست نگر رہنے میں وہ اپنی ذلّت محسوس کرتی تھیں۔

کملا کو اندرا کے بارے میں اور اُس کی تعلیم اور مستقبل کے بارے میں بھی فکر رہتی تھی۔ ان سب باتوں نے اور اُن کی تنہائی نے اُن کی کمزور صحت پر اور خراب اثر ڈالا۔ ایسے بھی دِن آتے جب نوجوان کملا کو زندگی بہت دشوار لگنے لگتی۔

دسمبر 1921 سے مارچ 1923 تک جواہر لال نے تین سو پچاس دِن جیل میں گزارے۔ 1924 کے آخر میں کملا کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جو صرف دو دِن زندہ رہا۔ اُس کی پیدائش نے کملا کی بیماری کو اور سنگین بنادیا۔ اُن کو تپِ دق (ٹی۔بی) کی بیماری بتائی گئی۔ اور ڈاکٹروں کے مشورے پر اُنھیں علاج کے لیے سوئزرلینڈ لے جایا گیا۔

موتی لال ہمیشہ اپنی بہو کا بہت لاڈ کرتے تھے۔ اگرچہ پیسے کی کمی تھی لیکن اُنھوں نے طے کیا کہ کملا کو پھر سے صحت یاب کرنے میں کِسی طرح کی رُکاوٹ نہیں پڑنے دی جائے گی۔

جواہر لال نے جنیوا میں اپنے قیام کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بہت سی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ لوگوں سے ملے اور آزادی کے لیے ہندوستان کی جدّوجہد کے بارے میں پُرجوش تقریریں کیں۔ اِندرا کو قریب کے ایک رہائشی اسکول میں داخل کرادیا گیا۔

کملا بیمار، اکثر تنہا، اب بھی بہت کم عمر، وقت کاٹنا اُن کے لیے مشکل ہو جاتا۔ اُنھوں نے یہ وقت، آس پاس کا مشاہدہ کرنے، دوستوں کو خط لکھنے، پڑھنے، اور خود کو تعلیم دینے پر، اور دوسری چیزوں کے ساتھ اردو پڑھنا لکھنا سیکھنے پر صرف کیا۔ یورپ کے قیام نے وہاں کی عورتوں اور ہندوستان کی عورتوں کی ترقّی کے معیار میں زبردست فرق کو کملا پر واضح کیا۔ اُنھوں نے سمجھ لیا کہ مردوں اور عورتوں میں برابری پیدا کرنے کے لیے پہلا قدم تعلیم ہے۔

عورتوں کا رول

جواہر لال نے دُنیا کے بعض بہترین اسکولوں میں پڑھا تھا، اُن کی بیوی ہونے کی حیثیت سے کملا کو شدّت سے اِس بات کی تکلیف ہوتی تھی کہ اُنھیں باقاعدہ تعلیم سے محض اِس لیے محروم رکھا گیا کہ وہ ایک لڑکی تھیں۔ اُنھیں اپنے شوہر کے ٹکر کی ہونے اور خود اپنی آمدنی رکھنے کی زبردست خواہش تھی۔ وہ اِس بات کی قائل تھیں کہ جب تک عورتیں غیر تعلیم یافتہ رہیں گی مُلک آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہندوستان کی وہ عورتیں اُن کی سمجھ میں ہی نہیں آتی

تھیں جو خوش قسمتی سے تعلیم تو حاصل کر لیتیں لیکن شادی کر کے اطمینان سے گھر میں بیٹھ جاتیں۔ کملا شدّت سے محسوس کرتی تھیں کہ ملک کو اُن کی اور اُن کے کام کی ضرورت ہے۔

پردہ ایک اور رواج تھا جو عورتوں کو غلام بناتا اور گھر میں محدود رکھتا۔ خاندانی دوست ڈاکٹر □ محمود اور اُن کی بیوی کو یورپ سے لکھے ہوئے کملا کی خطوں سے اس موضوع پر اُن کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمود کو اُنھوں نے لِکھا کہ وہ اپنی بچیوں کو پڑھائیں اور اُن سے پردہ نہ کرائیں۔ تعلیم کی کمی اور پردہ ہندوستانی عورتوں کی ایک پوری نسل کو اپنی صلاحیتوں اور اپنے حقوق کو جاننے اور پہچاننے سے روکے ہوئے ہیں۔ سوئزرلینڈ میں اسپتال میں اپنے بستر پر لیٹے لیٹے کملا نے ہندوستان واپس آکر اپنے ملک میں عورتوں کی حالت سُدھارنے کے لیے کام کرنے کا تہیہ کیا۔ وہ مانتی تھیں کہ آزادی کی جدّوجہد کے لیے اُن کو اور دوسری عورتوں کو اتنا ہی کرنا ہے جتنا مردوں کو۔ وہ خدا سے پوری لگن کے ساتھ یہ دعا مانگتیں کہ ملک کے لیے کام کرنے کے واسطے وہ اُنھیں قوّت دے۔ 1927 کے آخر میں کملا کی صحت بہتر ہوئی اور یہ لوگ ہندوستان واپس آئے۔

گاندھی جی سے عقیدت

ہندوستان واپس پہنچتے ہی جواہر لال سیدھے قومی سیاست میں شریک ہوگئے۔ حکومت کے خلاف مظاہروں میں وہ آگے آگے ہوتے۔ اکثر کملا بھی اُن کے ساتھ ہوتیں۔ کملا کو گاندھی جی سے گہرا لگاؤ تھا۔ جیسا کہ گاندھی جی کو بھی اُن سے تھا۔ گاندھی جی کملا کو بیٹی کی طرح مانتے تھے۔ کملا اپنے مزاج کے وجہ سے گاندھی جی کے نظریات کو آسانی کے ساتھ اپنا سکیں۔ خاموش اور متین، وہ نہ کبھی غصّے میں آتیں اور نہ کبھی زور سے بولتیں۔ پھر بھی جن باتوں پر وہ یقین رکھتی تھیں اور جن باتوں کو وہ صحیح مانتی تھیں اُن کا اثر نہرو خاندان کی تین نسلوں پر، موتی لال، جواہر لال، اور اِندرا پر گہرا پڑا۔

نومبر 1957 میں اپنے مضمون میں اِندرا گاندھی نے لِکھا کہ ایک رشتہ دار اِندرا کے لیے ایک بہت خوبصورت فراک لے کر آئیں۔ کملا نے وہ فراک یہ کہہ کر واپس کردی "ہم سب اب کھادی پہنتے ہیں" جب مہمان نے اصرار کیا کہ بچّے کو جو پسند ہو اُسے پہننے دیا جائے تو

کملا نے اپنی بیٹی کو بُلا کر کہا" اِندو! چاچی تمھارے لیے باہر کی ایک فراک لائی ہیں۔ بہت خوبصورت ہے تم چاہو تو پہن سکتی ہو لیکن پہلے اُس آگ کو یاد کرنا جس میں ہم نے اپنی بدیسی چیزیں جلائی تھیں۔ کیا تم اِسے پہننا پسند کروگی جب کہ ہم سب کھادی پہن رہے ہیں؟" اِندرا کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن اُنھوں نے فراک واپس کردی۔ "ضمیر" اور "فرض" سے یہ اُن کا پہلا واسطہ تھا۔ یہ لفظ وہ گھر میں بار بار سُنا کرتی تھیں۔ لیکن اُس کے صحیح معنی اُنھوں نے اپنے والدین اور خاص کر ماں کے عمل سے سمجھے تھے۔

دسمبر 1929 میں لاہور کے کانگریس اِجلاس میں موتی لال نے صدارت اپنے بیٹے جواہر لال کو سونپ دی۔ جنوری 1930 میں کملا کے مکمل اتفاق اور تائید سے جواہر لال نے "مکمل آزادی" کے لیے اپنا اعلان پڑھ کر سُنایا۔ اور گاندھی جی نے پورے ملک میں ستیہ گرِہ کرنے کا اعلان کردیا۔ اپریل آتے آتے جب سِول نافرمانی کی تحریک نے زور پکڑا تو پورے ملک میں بے چینی کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ جواہر لال اور کانگریس کے دوسرے رہنماؤں کو جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔

اِس موقعے پر کملا نہرو اور دوسری خواتین قوم کی آزادی کی جدو جہد کے میدان میں اُتر آئیں۔ کمزور صحت کے باوجود کملا برابر دورے کرتیں۔ زیادہ سے زیادہ عورتوں سے پردہ چھوڑ کر آزادی کی لڑائی کے لیے گھر سے باہر نکِل پڑنے کو کہتیں۔ وہ بیرونی ملکوں کا کپڑا بیچنے والی دکانوں پر دھرنا دیتیں، جلوس نکالتیں۔ جلسے کرتیں، اور پولیس کی لاٹھی چارج سہتیں۔

گرِفتاری

جب سے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا اُس کے ممبر برابر گرفتار کیے جارہے تھے۔ جلد ہی اُن کے بجائے عورتوں کو ممبر بھرتی کیا جانے لگا۔ نئے ممبروں میں آگے آگے کملا نہرو تھیں۔ وہ دور دراز کے سفر کرتیں گرفتار ہوتیں۔ موسم کی سختیاں جھیلتیں، اور اپنی صحت اور اِندرا کا بھی خیال نہ کرتیں۔ اُس زمانے میں کملا، الہ آباد ضلع کانگریس کی بھی صدر تھیں اور سِول نافرمانی کی تحریک کے لیے رضاکار اور امداد جمع کرنے کے لیے، مستقل شہر اور ضلع کا دورہ کرتیں۔

آزادی کی خاطر لڑنے کے لیے گاندھی جی کی بُلاوے پر بمبئی میں کچھ عورتوں نے 1921 میں 'راشٹریہ اِستری سبھا' یا 'نیشنل کاؤنسل فار ویمن' قائم کی۔ کملا کئی برس سے اُس کی ممبر تھیں اور اُنھوں نے ہریجنوں کے لیے مندروں کے دروازے کھلوانے کی بہت جدوجہد کی۔

یکم جنوری 1931 کو مکمل آزادی کی مانگ کے لیے وہی تقریر پڑھنے پر جو اُن کے شوہر نے پچھلے سال کی تھی اُنھیں گرفتار کرلیا گیا۔ اگرچہ وہ اندرا کے لیے پریشان تھیں لیکن اُنھیں یہ اطمینان تھا کہ وہ اور اُن کے شوہر گاندھی جی کی پیروی کرتے ہوئے اُس مقصد کی خاطر جیل میں تھے 'جو اُن دونوں کو بہت عزیز تھا۔ یعنی ملک کی آزادی کے لیے جدّوجہد۔

6ر فروری 1931 کو موتی لال کا اِنتقال ہو گیا اور کملا کو سزا پوری ہونے سے پہلے چھوڑ دیا گیا۔ موتی لال کے مرنے کا جواہر لال اور کملا دونوں پر گہرا اثر ہوا۔ آزادی کی تحریک میں اپنے بیٹے کی شرکت کو قبول کرنے کے بعد موتی لال مضبوطی کے ساتھ جواہر لال کی پشت پناہی کرتے رہے۔ اُن کے انتقال کے بعد اُن کی مستقل توجہ اور خبر گیری کے بغیر اور جواہر لال کے اکثر جیل میں جانے کی وجہ سے کملا کی صحت ایک دَم پھر خراب ہو گئی۔ لیکن کام تو آگے بڑھنا ہی تھا۔

بیماری

سوراج بھون میں شروع کیے گئے اِلہ آباد کانگریس اسپتال میں کملا پوری طرح سے سرگرم تھیں۔ اپریل 1932 میں اسپتال سوراج بھون کے برابر کی ایک عمارت میں منتقل کر دیا گیا کیوں کہ اُس سال جنوری میں انگریزی حکومت نے اسپتال کی عمات اور ہزاروں روپے کی دوائیوں کو اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔ یہ اسپتال کسی نہ کِسی طرح چلتا رہا۔ کملا نہرو کے انتقال کے کچھ سال بعد گاندھی جی نے 9ر نومبر 1939 'کو کملا نہرو میموریل اسپتال' کی عمارت کے لیے کونے کا پتھر نصب کیا اور پندرہ مہینے بعد اسپتال کا افتتاح کیا۔ آج یہ اسپتال اُتر پردیش کا سب سے بہتر سازو سامان رکھنے والا اسپتال ہے۔ یہ کملا نہرو کی سالہا سال کی محنت اور خدمت کی سب سے موزوں یادگار ہے۔

1931 سے 1934 تک کملا کی صحت بڑی تشویش کا سبب بنی رہی۔

وہ اکیلی تھیں جواہر لال کافی لمبے لمبے عرصے جیل میں رہتے تھے۔ کملا کو یہ بھی صدمہ تھا کہ اُن کی صحت کی خرابی اُنھیں بار بار بستر پر لٹائے رکھتی تھی۔ لیکن جب بھی اُن کی صحت ذرا سی بھی بہتر ہوتی وہ اُٹھ کر چل پڑتیں۔ جلسوں کا انتظام اور اُن میں تقریریں کرتیں۔ وہ اُس بخار کے باوجود جو اُنھیں کھائے لے رہا تھا کام میں لگی رہتیں۔ جب جواہر لال نہرو جیل سے باہر آتے اور ملک کا دورہ کرتے تو کملا اُن کے ساتھ ہوتیں اور اُن کے شوہر دیکھتے کہ وہ کتنی کمزور ہو گئی ہیں "اُن کا جوش اور ارادہ ہی اُنھیں کھڑا رکھے ہوئے ہے" اُنھوں نے گاندھی جی کو لکھا تھا۔ جواہر لال کی موجودگی میں کملا بہتر محسوس کرتیں۔ پھر بھی جب برطانوی حکومت نے جواہر لال کو اِس شرط پر رہا کرنے کی پیش کش کی کہ وہ سیاسی کام نہ کریں تو سب سے پہلے کملا نے ہی اِس کی مخالفت کی۔

موتی لال کے انتقال اور جواہر لال کے جیل میں ہونے کی وجہ سے کملا' سیاسی کاموں کے علاوہ گھر کے کاموں کی بھی ذمے داری سنبھالتیں۔ اکتوبر 1933 میں جب جواہر لال کی چھوٹی بہن کرشنا کی شادی آنند بھون میں ہوئی تو گھر کی بہو ہونے کی حیثیت سے شادی کا سارا انتظام اُنھوں نے اپنے سر لیا۔

ہندوستانی قدریں

پہلے سیاسی کاموں کے سلسلے میں' پھر مشہور طبیب ڈاکٹر۔ بی۔ سی۔ رائے سے اپنا علاج کرانے اور پھر اِندرا کو گرودیو ٹیگور کے شانتی نکیتن میں داخل کرانے کے بعد' کملا کا بار بار کلکتے آنا جانا رہا۔ جہاں راما کرشنا مشن سے اُن کا رابطہ قائم ہو گیا اور وہ فوراً اُس کی طرف کھنچ گئیں۔ وہ روائتی ہندوستانی قدروں اور اعتقادات کے ماحول میں پیدا ہوئیں اور پلی بڑھی تھیں اور برسوں بعد بھی اُن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ گاندھی جی سے اُن کے رابطے اور لاعلاج بیماری سے برسوں لڑتے رہنے سے اُن کی فطری سادگی اور نیکی کو اور اُجاگر کر دیا۔ وہ صرف کھادی پہنتی تھیں بلکہ ہر طرح کا زیور پہننا بھی اُنھوں نے چھوڑ دیا تھا۔ اُن کی ضروریات بہت کم اور انتہائی سادہ تھیں۔ اور کلکتے میں 'بیلور مٹھ' پر راما کرشنا مشن سے تعلق

ہو جانے کے بعد وہ کئی کئی گھنٹے دھیان گیان میں صرف کرتیں۔ وہ شری راما کرشنا پرم ہمسا اور سوامی وِویکا نند کی زندگیوں اور تعلیمات سے بہت متاثر ہوئیں۔ اُنھوں نے بھگود گیتا بھی پڑھی اور لِکھا کہ اِس سے اُنھیں بڑا آنند مِلا۔

کملا کی ساس 'سروپ رانی' اپنی بہو کی سنیاسن جیسی زندگی سے کلِستی تھیں۔ اگرچہ نہرو خاندان نے اپنی پہلی ٹھاٹھ باٹ والی زندگی کے سارے لوازمات عرصہ ہوا چھوڑ دیئے تھے لیکن سروپ رانی یہ چاہتی تھیں کہ کملا کچھ نہ کچھ زیور۔ مثلاً ایک ہار 'دو ایک چوڑیاں' ضرور پہنیں جو ایک ہندو 'بیاہتا عورت کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ لیکن کملا ایسی روائتی رسموں کی پابندی کرنا بہت پہلے ختم کر چکی تھیں۔ اپنی طے کی ہوئی منزل۔ خدمت۔ کی طرف وہ ایسی یک سوئی اور خلوص کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں جو اتنی نوجوان اور مستقل بیمار رہنے والی خاتون کے لیے حیرت ناک بات تھی۔ وہ محسوس کرتی تھیں کہ "سڑکوں پر اپنے زیورات کی نمائش کرتے پھرنا ایک مجرمانہ حرکت ہے جبکہ میرے وطن کے لوگوں کے پاس پیٹ بھرنے کے لیے غذا بھی نہیں ہے۔"

ایک موقعہ پر کملا اور سروپ رانی گرمیوں میں ایک دِن بغیر پنکھے کے بیٹھی ہوئی تھیں۔ سوامی اَبھے آنند نے سروپ رانی کی اُس اذیت کو بیان کیا ہے کہ وہ یہ سوچ کر رو پڑیں کہ اُن کا لاڈلا بیٹا جیل میں بغیر پنکھے کے رہ رہا ہے۔ ایک لمحے میں کملا کے چہرے کا سکون دُرشتی میں بدل گیا۔ بڑے جذبات میں اُنھوں نے کہا "اماں! تم صِرف اپنے جواہر کے بارے میں سوچتی ہو کیا تم اُن تیس پینتیس ہزار جوان۔ مردوں اور عورتوں کے دُکھ بھول گئیں جو اِس وقت انگریزوں کی جیلوں میں ہیں؟"

1934 میں بہار کے زلزلے میں کملا تیزی سے متاثرہ علاقوں میں پہنچیں۔ وہ غریب اور بے گھر لوگوں میں دوائیاں اور دوسرا سامان بانٹتی پھریں۔ لیکن اِس دورے نے اُن کی صحت کو زبردست نقصان پہنچایا' اور اُن کی حالت روز بروز گرتی چلی گئی۔ اُن کی بیماری کو اب صاف طور پر تپِ دق قرار دے گیا گیا۔ الہ آباد میں چوں کہ اس کے علاج کی سہولیات نہیں تھیں اِس لیے کملا کو کماؤں کی پہاڑیوں میں واقع "بھووالی سینی ٹوریم" لے جایا گیا۔

بھوالی سینی ٹوریم میں کملا کے قیام سے اُن کی حالت کچھ عرصے کے لیے سنبھل گئی۔ آرام' علاج اور آب و ہوا نے اُن کی بیماری کو بڑھنے سے روک دیا۔ شدید تپِ دق سے یہ پرانی تپِ دق کی حالت پر ٹھہر گئی۔ کملا کی صحت کا خیال کرتے ہوئے برطانوی حکومت نے جواہر لال کو اِلہ آباد کے قریب کی نینی جیل سے بھوالی کے قریب الموڑہ جیل میں منتقل کر دیا ۔ اُنھیں تین ہفتے میں ایک مرتبہ اپنی بیوی سے ملنے کی اجازت بھی مل گئی۔ یہ ملاقاتیں شوہر اور بیوی دونوں کے لیے نہایت قیمتی تھیں۔ خاص طور پر جواہر لال کے لیے جنھیں یہ خوف لگا رہا رہتا کہ اب جب کہ اُنھوں نے کملا کو واقعیٔ جاننا اور سمجھنا شروع کر دیا ہے'۔ موت اُنھیں چھین نہ لے جائے۔

بہادرانہ جذبہ

مارچ 1935 میں بھووالی کے ڈاکٹروں نے محسوس کیا کہ مزید علاج کے لیے کملا کو یورپ جانا چاہیے۔ چونکہ جواہر لال جیل میں تھے 'اِس لیے کملا' اندرا اور اپنے رشتے کے بھائی ڈاکٹر مدن اٹل کے ساتھ یورپ کے لیے روانہ ہو گئیں۔ ستمبر میں اُن کی حالت اور خراب ہو گئی اور جواہر لال کو الموڑہ جیل سے رہا کر دیا گیا۔ 9 ر ستمبر کو جواہر لال ہوائی جہاز سے اپنی بیمار بیوی کے پاس جرمنی میں 'بیڈین ویلر' پہنچے ۔ جواہر لال کے آجانے سے کملا بیماری کے شدیدی حملے کو جھیل گئیں۔ اور اُن کی طبیعت کچھ بہتر نظر آنے لگی۔ جواہر لال قریب کے ایک گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے اور صبح شام کملا کے ساتھ کچھ وقت گزارنے پیدل آتے جاتے ۔ کملا اب بھی بہت بیمار تھیں اور لمبی بات چیت اُنھیں تھکا دیتی تھی۔ پھر بھی اُن کا بہادرانہ جذبہ اُن کی توجہ مستقبل کی طرف رکھتا۔ وہ اور جواہر لال اکثر ہندوستان کی بات کرتے۔ اُس کے مقصد کی بات کرتے اور یہ کہ واپس جا کر اُنھیں کیا کرنا ہو گا۔

کملا کی حالت بہتر ہوتی گئی تو جواہر لال اور اِندرا' تھوڑے دِن کے لیے انگلستان چلے گئے۔ کرسمس کے موقعے پر کملا کی حالت پھر خراب ہوئی اور اگر چہ کملا نے اپنی پوری قوت سے اُس کا مقابلہ کیا۔ پھر بھی تقدیر کا لکھا نظر آنے لگا۔ اور یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ خاتمہ اب قریب ہے۔ کملا 'بیڈین ویلر' کے سینی ٹوریم سے چلی جانا چاہتی تھیں۔ اِس کی ایک وجہ

سینی ٹوریم کے ایک اور مریض کا اچانک انتقال تھا۔ وہ ایک آئرش لڑکا تھا جو کبھی کبھی کملا سے ملنے آیا کرتا تھا اور کملا سے بہت بہتر اور طاقتور لگتا تھا۔ جنوری 1936 کے آخر میں کملا کو سوئزر لینڈ میں نورین کے قریب ایک اور سینی ٹوریم میں داخل کر دیا گیا۔ اِندرا کا اسکول بھی زیادہ دور نہیں تھا۔

اَلمناک حادثہ

اِس دوران جواہر لال کو دوبارہ اِنڈین نیشنل کانگریس کا صدر چُن لیا گیا تھا۔ کملا کو چھوڑ کر کچھ دِن کے لیے ہندوستان جانے یا صدارت سے انکار کر دینے کے بارے میں پریشان رہ کر جواہر لال نے آخر فروری کے آخر میں ہندوستانی چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن بیماری سے' جس نے اُن کے بدن کو کھا ڈالا تھا' کملا کی جنگ اب خاتمہ کے قریب تھی۔ 28ر فروری کو صبح سویرے کملا نہیں رہی تھیں۔

اُن کی موت سے غم کی لہر دور دور پھیل گئی۔ نہ صِرف الہ آباد میں جہاں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنا کام روک دیا اور جھنڈے جھکا دیئے گئے۔ وہ لوگ بھی اِس صدمے سے متاثر ہوئے جو کملا سے مِل چکے تھے۔ سیاسی کاموں میں لگے رہنے کے باوجود' کئی مہینے تک جواہر لال ٹوٹے ہوئے رہے۔ ہر موڑ پر وہ کملا کے خاموش' لیکن مضبوط اخلاقی سہارے کی کمی محسوس کرتے۔ اُن کی موت کے بعد جواہر لال کو محسوس ہوا کہ انھوں نے کملا سے بے توجہی برتی تھی۔ اُنھیں یاد آیا کہ اتنی کم عمر میں' کتنے لمبے عرصے کی تنہائی اور اکیلا پن کملا نے جھیلا تھا۔ اُن کی بیماری کے زمانے میں اُن کی مناسب دیکھ بھال نہ کرنے کا الزام بھی وہ اپنے آپ کو دیتے تھے۔ اگرچہ وہ ایسے مقصد کی خاطر تھی جو دونوں کے لیے اہم تھا۔

یہ کملا نہرو کے اپنے کردار کی خوبی اور مضبوطی تھی کہ ایک ایسے خاندان کی فرد بن کر جو ذہنی اور سماجی طور پر بڑے لوگوں کا خاندان تھا اور جو ہندوستان کی آزادی کے لیے جدو جہد میں سب سے آگے تھا' وہ نہ صرف اپنے کردار پر جمی رہیں بلکہ اہم موقعوں پر اُس خاندان پر اپنا ہی اثر ڈال سکیں۔ اُن کے مزاج اور کردار کی اِسی خوبی کو ڈاکٹر۔ بی۔ سی رائے نے دِل و دماغ کی اعلیٰ خصوصیات بتایا۔ گاندھی جی نے اُن کے بارے میں کہا ''میں نے اُن سے زیادہ

سچی زیادہ بہادر اور خدا سے زیادہ ڈرنے والی خاتون نہیں دیکھی۔"

اپنی کمزور صحت اور المناک حد تک مختصر زندگی کے باوجود کملا نہرو نے ہندوستان کی قومی تحریک میں جو حصہ لیا اُس کو بھلایا نہیں جا سکے گا۔ وہ ایک روایتی ہندوستانی خاتون تھیں لیکن عورتوں کے حقوق کے لیے وہ زبردست لڑائی لڑنے والی بھی تھیں۔ وہ ایک مضبوط ہندوستانی عورت کی تصویر تھیں جو اپنے خاندان کے لیے ریڑھ کی ہڈی بن کر رہیں۔

اپنی بیماری اور زندگی کی دوسری مصیبتوں اور پریشانیوں کو بڑی ہمّت کے ساتھ اور آرام اور دُکھ سے بے نیاز رہتے ہوئے برداشت کرتی رہیں۔ بڑی غیرت حمیت اور اپنے اوپر گہرا اعتماد رکھنے والی خاتون، جن کی اپنی ضروریات کم سے کم تھیں۔ اُنھوں نے ایک طوفانی عہد میں زندگی بسر کی جو بہت سے بڑے آدمیوں اور عورتوں کو سامنے لایا۔ لیکن کملا نہرو کو بھول جانے میں ہندوستان کو بہت عرصہ لگے گا۔ اور برسوں بعد کوئی ایسی ہستی پیدا ہو گی۔

"یکم جنوری 1931 کو' سال کا پہلا دن' ہمارے لیے کملا کی گرفتاری کی خبر لایا۔ میں خوش ہوا۔ کیوں کہ اپنے بہت سے ساتھیوں کی طرح جیل جانے کی اُسے کتنی تمنا تھی۔ ... اُس کی دِلی خواہش اب پوری ہوئی۔ وہ کتنی خوش ہو گی! میں نے سوچا.... جب وہ گرفتار ہوئی تو ایک اخبار والے نے اُس سے پیغام مانگا۔ اور اُسی لمحے' غالبًا غیر شعوری طور پر' اُس نے ایک مختصر پیغام دیا' جو اُس کی خصوصیت تھی میں بے انتہا خوش ہوں۔ اور اپنے شوہر کے قدم بہ قدم چلنے کا مجھے فخر ہے۔ میں اُمید کرتی ہوں کہ لوگ پرچم لہرائے رکھیں گے۔'

شاید اُس نے صرف اتنا نہ کہا ہوتا اگر وہ سوچ کر کچھ کہتی۔ کیوں کہ وہ اپنے آپ کو مردوں کے ظلم اور زیادتی کے خلاف' اور عورتوں کے حقوق کے لیے لڑنے والی سورما سمجھتی تھی...."

جواہر لال نہرو

(خود نوشت)

لال بہادر شاستری

گرِجارانی استھانا

"ہندوستان کو عملی سوشلزم کی ضرورت ہے۔ اہم چیز یہ ہے کہ ہم اپنے عوام کو کھانے پینے کی چیزوں 'لِباس 'مکان 'دوا علاج 'اور روزگار کے معاملوں میں اپنی ضرورتیں خود ہی پوری کرنے والا بنادیں۔ ہم ان چیزوں کو جتنا لوگوں کے لیے مہیا کر سکتے ہیں اتنا ہی ہم اپنی سوشلزم کی منزل سے قریب پہنچیں گے۔ امیر اور غریب کے حالات میں جو فرق ہے اُسے ختم کرنا ہوگا۔ عام آدمی کے معیارِ زندگی کو اونچا کرنا ہوگا....."

لال بہادر شاستری

لال بہادر شاستری

پریاگ کے متبرک شہر میں 14ر فروری 1905 کو سنکرانتی کے دِن گنگا کے کنارے ہزاروں لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ اِنسانوں کا ٹھاٹیں مارتا ایک سمندر سا تھا۔ بھیڑ میں برابر دھکّے کھاتے ہوئے بھی لوگ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اِن ہی میں ایک نوجوان جوڑا بھی تھا۔ شاردا پرشاد اور اُس کی کم عمر بیوی رام دُلاری دیوی۔ جو چار مہینے کے اپنے بیٹے کو مضبوطی کے ساتھ چمٹائے ہوئے تھی۔

اچانک رام دُلاری کو لوگوں کے ایک ریلے کا دھکّا لگا۔ جس سے وہ سنبھل نہ سکی اور گرِ پڑی۔ بچّہ اُس کی گود سے چھوٹ گیا۔ وہ بہت تیزی سے اُٹھی اور اپنے بیٹے کو تلاش کرنے لگی۔ ''ہائے رام'' وہ تو زمین پر تھا ہی نہیں۔ کیا کوئی اُس کے بچّے کو اُٹھا لے گیا؟ شاردا پرشاد کو پتہ چلا تو گھبرا کر اُس نے اِدھر اُدھر ڈھونڈنا شروع کیا۔ مگر بچّے کا کہیں پتہ نہ چلا۔ قسمت کی ماری ماں، دریا کے کنارے بیٹھی زار زار رونے لگی۔ وہ اُس جگہ سے اُٹھنے کے لیے تیار نہ تھی۔ راہ چلتے کچھ ہمدردوں کی مدد سے شاردا پرشاد نے پھر تلاش شروع کی۔

مسافروں کو پار لے جانے کے لیے بہت سی کشتیاں کنارے سے لگی کھڑی تھیں۔ ایک غریب گوالا ایک کشتی میں بیٹھا بھیڑ کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اُس نے دیکھا کہ کپڑے کی ایک گٹھری اُس کی ٹوکری میں آن پڑی۔ گٹھری میں ایک بچہ تھا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ ہوا یہ کہ رام دُلاری کی گود سے چھوٹ کر بچہ زمین پر یا پانی میں گرِنے کے بجائے سیدھا اُس کی ٹوکری میں جا گرِا۔ اُس غریب کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اُس نے سوچا گنگا میاّ نے اُسے یہ تحفہ دیا ہے۔ جلدی سے اُس نے بچے کو اُٹھایا۔ گرِنے کی وجہ سے بچہ رونے لگا تھا۔ اُس نے جلدی سے

کپڑے کا ایک کونہ دودھ میں بھگو دیا اور بچے کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

شاردا پرشاد جو لوگوں کو لے کر بچے کو تلاش کرنے نکلا تھا' خالی ہاتھ لوٹا۔ اِس خبر کے صدمے سے ماں کا تو اور برا حال ہو گیا۔ اچانک شاردا پرشاد کی نظر کشتی میں رکھی اُس ٹوکری پر پڑی جس میں بچہ آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا یہ تو اُس کا اپنا ننھا تھا۔ کشتی میں کود کر اُس نے بچّے کو گود میں اُٹھالیا۔ کشتی میں بیٹھے آدمی نے پہلے تو بچے کو دینے سے انکار کیا لیکن جب رام دُلاری آئی تو بچّہ اُسے دے دیا۔ رام دُلاری نے "گنگا میا" کا شکر ادا کیا اور اپنے ننھے کو "گنگا پتر" کہنا شروع کر دیا۔

یہ گنگا پتر کوئی اور نہیں' لال بہادر شاستری ہی تھے۔ جواہر لال نہرو کے جانشین' آزاد ہندوستان کے دوسرے وزیر اعظم۔

نیک ماں

لال بہادر 2/ اکتوبر 1904 کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ گاندھی جی کا جنم بھی 2/ اکتوبر 1869 کو ہوا تھا۔ جن کے زبردست اثر نے لال بہادر کے کردار کو ایک سانچے میں ڈھال دیا۔

لال بہادر کے والد ایک غریب اسکول ماسٹر تھے۔ اُن کے تین بچّے تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بیٹا سب سے چھوٹا اور اِس لیے سب کا لاڈلا تھا۔

لال بہادر ڈیڑھ سال ہی کے تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اِس سانحے نے رام دُلاری کو بدحال کر دیا۔ لیکن اُنھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ بچوں کی پرورِش اب اُنھیں کو کرنی تھی۔ اپنے باپ کے ساتھ رہنے وہ بنارس سے مرزا پور آگئیں۔

رام دُلاری بہت نیک خاتون تھیں۔ اگرچہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ لیکن اُن کے اِرادے کی مضبوطی' اعلیٰ کردار اور فرض کی ادائیگی کے جذبے نے اُنھیں ایک بہترین ماں بنا دیا۔ بیٹے کی شروع کی زندگی کو ڈھالنے میں اُن کا بڑا ہاتھ رہا۔ بیٹے نے ماں کی خصوصیات ہی کو اپنایا۔ وہی کردار کی مضبوطی' اِرادے کی پختگی' اور ایمان داری جس نے بعد میں ہندوستان بلکہ دنیا کو اُن کا مدّاح بنا دیا۔

لال بہادر نے ابتدائی بچپن اپنے نانا کے گھر گزارا۔ اگرچہ اُن کا انتقال بھی جلدی ہی ہو گیا لیکن اُن کے سب ماموں اور ممانیاں اُن کا بہت خیال رکھتے اور اُن سے پیار کرتے تھے۔ گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے سب ہی ان سے پیار سے ملتے تھے اور اُن کا لاڈ کرتے تھے۔

مرزاپور میں اپنی ابتدائی تعلیم پوری کرنے کے بعد' آگے کی تعلیم کے لیے لال بہادر بنارس آگئے۔ اور ہریش چندر وِدیالیہ میں داخل ہوئے۔ اب وہ اپنے خالو کے گھر رہتے تھے۔ یہاں کا ماحول مرزاپور کے گھر کے ماحول سے بہت بدلا ہوا تھا۔ یہاں اُن کو وہ پیار اور محبّت نہیں ملی جس کی اُنھیں عادت تھی۔ بلکہ اُن کے ساتھ بہت خراب سلوک بھی کیا جاتا تھا۔ قِسمت کا رونا رونے کے بجائے بچے نے اِس سے بھی فائدہ اٹھایا۔ کہتے ہیں بادلوں کے کنارے روشن ہوتے ہیں۔ جو سختیاں اُنھوں نے جھیلیں اُن سے آنے والی زندگی میں مشکلوں کا مسکرا کر مقابلہ کرنا اُنھیں آگیا۔ اُن کی شروع کی غربت نے اُنھیں ہندوستان کے غریب لوگوں کے اور قریب کر دیا۔ غریبوں کی سخت محنت اور تکلیفوں سے وہ واقف تھے کیوں کہ اُنھوں نے خود ایسی زندگی گزاری تھی۔ اسی وجہ سے لوگ اُنھیں پسند کرتے تھے۔

ہریش چندر ودّیالیہ میں لال بہادر اپنے حساب کے استاد نشکمیشور پرشاد مسرا کو بہت چاہنے لگے۔ مدرسہ کے اِن استاد نے 'اثر قبول کر لینے والی عمر میں اِن کے کردار اور شخصیت کو سانچے میں ڈھالا۔ مِسرا اُن کے لیے ایک مضمون پڑھانے والے اُستاد ہی نہیں تھے بلکہ اُس سے زیادہ تھے۔ وہ پچھلے زمانے کی طرح ایک 'گرو' تھے جو اپنے شاگِردوں کی چو طرفہ نشو نما پر بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ دھیان دیتے تھے۔ وہ گنگا کے کنارے ریت پر بیٹھے دیر تک اپنے شاگردوں کو لوک مانیہ بال گنگا دھر تِلک' کے اِس جادو بھرے نعرے کے معنی اور مطلب سمجھاتے کہ "سوراجیہ میرا پیدائشی حق ہے اور اِس کو میں لے کر رہوں گا" وہ اُن کو مہارانا پرتاپ' چھترپتی شیوا جی 'گرو گوبند سنگھ اور دوسرے بڑے بڑے قومی سورماؤں کی حب الوطنی کے کارنامے سناتے۔

لال بہادر کے لیے مِسرا 'ایک باپ' دوست' رہنما اور فلسفی تھے جنھوں نے ایک حسّاس بچے کو سنبھالا اور اُس میں آئندہ کی بڑائی کے بیج بوئے۔ وہ لال بہادر میں ایسی خوبیاں دیکھ کر بہت خوش ہوتے جو عام طور پر اِس عمر کے بچوں میں نہیں ملتیں۔ اور وہ اپنا ہی بچہ سمجھ کر اُن کے ساتھ سلوک کرتے۔ لال بہادر کو وہ اپنے گھر لے گئے اور اپنی بیوی سے اُنھیں اپنا چوتھا

بیٹا سمجھنے کے لیے کہا۔ لال بہادر بھی نشکمیشور پرشاد مِسرا کے خاندان کو اپنا ہی سمجھتے رہے۔ یہ رشتہ عمر بھر اِسی طرح قائم رہا۔

قومی بیداری

وہ قومی بیداری کے دِن تھے۔ تِلک' لاجپت رائے' بپن چندر پال اور مہاتما گاندھی جیسے رہنماؤں کی کوششوں سے آزادی کے لیے جدو جہد میں تیزی آنے لگی تھی۔ ہزار ہا لوگوں نے 'مردوں' عورتوں' جوانوں' بوڑھوں نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ اُن کا اور اُن کے مُلک کا کیا ہوگا۔ چھوٹے بچے بھی بڑھتی ہوئی قومی تحریک میں کھِنچ آئے تھے۔

اب مُلک کی رہنمائی گاندھی جی نے سنبھال لی تھی۔ لال بہادر اُس دِن کو کبھی نہیں بھول سکے جب اُنھوں نے پہلی بار گاندھی جی کو دیکھا اور سُنا۔ وہ مشکل سے گیارہ سال کے تھے جب گاندھی جی بنارس ہندو یونی ورسٹی کا سنگ بنیاد رکھنے بنارس آئے۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لاکھوں آدمی۔ عالم 'مُفکّر' سماج کی اصلاح کرنے والے' انگریز افسر' راجے مہاراجے اور عام شہری اُن کی تقریر سُننے آئے تھے۔ گاندھی جی نے تقریر کی۔ اُنھوں نے کھُلے طور پر غیر ملکیوں کے غلام ہونے کی شرمندگی کا ذِکر کیا۔ برطانوی حکومت کے ہاتھوں لوگوں کی لوٹ کھسوٹ اور بے چارگی کا ذِکر کیا' قوم کی آزادی کے حق کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے نہ صِرف برطانوی حکومت کی بلکہ اُس کے پِٹھوؤں۔ راجاؤں اور بہت پڑھے لکھے لوگوں کی بھی مذمت کی۔ لال بہادر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اتنے نرم مزاج اور دیکھنے میں کمزور شخص میں اِتنی کشش کہاں سے آئی۔ گاندھی جی کی ہمت اور عوام پر اُن کے جادو نے اُنھیں حیرت میں ڈال دیا۔ اُنھوں نے یہ بات سمجھ لی کہ 'سچ' اور 'اِنصاف' سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہو سکتی۔

چمپارن

مُلک کی فضا قوم پرستی اور آزادی کے جذبات سے اتنی بھری ہوئی تھی کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک سویا ہوا شیر اب جاگ اُٹھا ہے اور اُن زنجیروں کو توڑ ڈالنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے جو صدیوں سے اُسے جکڑے ہوئے تھیں۔

واقعات جلدی جلدی رونما ہو رہے تھے۔ نیل کی کھیتی کرانے والوں کی کِسانوں کی لوٹ

مچانے والی زیادتیوں کے خلاف 1917 میں چمپارن کی ستیہ گرہ' غیر ملکی راج کے خلاف گاندھی جی کی پہلی فتح تھی۔ پھر رَولیٹ ایکٹ نافذ ہوا جو 'سیاہ قانون' کہلایا۔ جس نے ججوں کو اختیار دیا کہ وہ سیاسی مقدموں کی شنوائی جیوری کے بغیر ہی کریں اور سیاست کے الزام میں گرفتار کیے گئے لوگوں کو پوری عدالتی کارروائی کے بغیر جیل بھیج دیں۔ اس کے فوراً بعد جلیانوالے باغ میں 'انگریزوں کے ہاتھوں نہتے ہندوستانیوں کو بھون ڈالے جانے کا موقعہ پیش آیا۔ ملک کو اُس سے سخت دھکا لگا۔ گاندھی جی نے تشدد کے بغیر سوِل نافرمانی کرنے کے لیے لوگوں کو پکارا۔ اُنھوں نے لوگوں سے سرکاری اسکولوں' دفتروں' عدالتوں کا اور باہر سے آئے کپڑوں بلکہ باہر سے آئی ہوئی ہر چیز کا بائیکاٹ کرنے کے لیے کہا۔ اُنھوں نے لوگوں سے ٹیکس نہ ادا کرنے کے لیے بھی کہا۔ ہزاروں طالب علم اِسکول چھوڑ کر نکل آئے۔ اُن میں لال بہادر بھی تھے۔ نِشکمیشور پرشاد مِسرا نے اُنھیں سمجھایا کہ وہ اسکول نہ چھوڑیں کیوں کہ بیوہ ماں اور دو بہنوں کی ذمے داری اُن پر تھی۔ لیکن لال بہادر نے اِس بار اُن کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا "یہ میرے وطن کی مانگ ہے "اُنھوں نے جواب دیا۔

عدم تعاون تحریک کے واپس لیے جانے پر لال بہادر نے اپنی تعلیم کے سلسلے کو پھر جاری کیا۔ وہ کاشی وِدّیا پیٹھ میں داخل ہو گئے۔ یہ قوم پرست اِدارہ محبِ وطن تعلیمی کام کرنے والوں نے اُن طالب علموں کے لیے قائم کیا تھا جو اسکولوں سے نکل آئے تھے۔ یہاں لال بہادر کا آچاریہ نریندر دیو۔ ڈاکٹر بھگوان داس' آچاریہ کرپلانی' سمپورنانند' شری پرکاش اور دوسرے ممتاز محبِ وطن لوگوں سے قریبی تعلق قائم ہوا۔ لال بہادر پر ڈاکٹر بھگوان داس کی "سمنوے واد" کا بہت اثر ہوا۔ یہ زندگی کا ایک رویّہ تھا جو ایک دوسرے کے بالکل خلاف سوچنے کے انداز میں مشترک باتیں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا تھا۔ اِس نظریے کے اثر سے لال بہادر نے بظاہر مخالف رائے رکھنے والوں کو ہم خیال بنا لینے میں مہارت حاصل کر لی۔ اِس خوبی نے اُنھیں کانگریس پارٹی میں سب سے کامیاب تال میل پیدا کرنے والا ثابت کیا۔

لال بہادر نے 1925 میں کاشی وِدّیا پیٹھ سے ڈگری حاصل کی۔ اسی لیے ان کے نام کے ساتھ شاستری کا لفظ جڑ گیا۔

سچی لگن

تعلیم مکمّل کر لینے کے بعد اُن کے سامنے اہم سوال یہ تھا کہ وہ اب کیا کریں؟ کیا وہ

ملازمت کر کے اپنی بوڑھی ماں کی دیکھ بھال کریں یا وہ آزادی کی جدّو جہد میں کود پڑیں۔ جب بھارت ماں انگریزوں کے ظالمانہ راج سے کچلی جارہی ہو تو لال بہادر اپنے خاندان کی دیکھ بھال کرنے کو سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے دوسرا والا راستہ اختیار کیا۔

1926 میں شاستری جی "لوگوں کی خدمت گاروں کی سوسائٹی" میں شامل ہو گئے۔ جسے لالہ لاجپت رائے نے آزادی کے لیے لمبی جدو جہد شروع کرنے کے واسطے قائم کیا تھا۔ اِس سوسائٹی کا مقصد ایسے قوم پرست کارکنوں کو تربیت دینا تھا جن کا فرض لوگوں کی تعلیمی اور سماجی بہتری کے لیے کام کرنا تھا۔ شاستری جی کو ہریجنوں کی بہتری کے لیے کام کرنا سونپا گیا تھا اور اس کام کے لیے اُنھیں میرٹھ بھیجا گیا۔ یہاں اُنھوں نے خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ دو سال کام کیا۔ اُنھوں نے بہت سے اونچی ذات کے ہندوؤں کو راضی کیا کہ وہ ہریجنوں کی طرف اپنے موجودہ روّیے کو تبدیل کریں اور ہریجنوں کو اچھوت نہ سمجھیں بلکہ اپنا بھائی سمجھیں۔

16 مئی 1928 کو شاستری جی نے 'مرزاپور ہی کے رہنے والے گنیش پرشاد کی سب سے چھوٹی بیٹی 'لال منی' سے جنھیں عام طور سے للتا دیوی کہا جاتا ہے۔ شادی کرلی۔ جہیز میں اُنھوں نے صرف ایک چرخا اور چند گز کھادی کی۔

1928 میں لالہ لاجپت رائے کا انتقال ہو گیا اور اُن کی جگہ پرشوتم داس ٹنڈن "لوگوں کی خدمات گاروں کی سوسائیٹی" کے صدر ہو گئے۔ لال بہادر شاسری اُس کے تیسرے صدر بنے اور اپنے انتقال تک وہی صدر رہے۔

پرشوتم داس ٹنڈن اُن کے پہلے سیاسی گُرو تھے۔ اُنھیں کے آمادہ کرنے کی وجہ سے شاستری جی کانگریس پارٹی میں شامل ہوئے۔ ٹنڈن جی نے ہی ان سے الہ آباد منتقل ہو جانے کے لیے کہا جو اُن کا دوسرا گھر بنا۔

عوامی زندگی

اِلہ آباد ہی میں شاستری جی نے اپنی طویل عوامی زندگی کی ابتدا کی۔ یہیں پر اُنھوں نے ایک ستیہ گرہی کے طور پر تین بار گرفتاریاں دیں۔ اور یہیں پر پنڈت نہرو سے ان کے لمبے اور قریبی تعلق کی ابتدا ہوئی۔

لال بہادر شاستری پہلے کانگریس کے کارکن' پھر شہر کانگریس کے سکریٹری' بعد میں

اِلٰہ آباد کانگریس کمیٹی کے سکریٹری اور پھر صدر بنے۔ اپنے کام سے اُنھیں بار بار انند بھون جانا ہوتا جو کانگریس تحریک اور سیاسی کارروائیوں کا مرکز تھا۔ موتی لال اِس نوجوان کے شریفانہ انداز اور نرم گفتاری سے متاثر ہوئے۔ جواہر لال اور لال بہادر شاستری جو ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے کانگریس سیاست کی درمیانہ روی سے کچھ باغی لگتے تھے اور اکثر آپس میں مشورے کیا کرتے تھے۔ شاستری جی دسمبر 1929 میں 'راوی کے کنارے کانگریس کے تاریخی اجلاس میں جواہر لال کی تقریر سُن کر'جس میں اُنھوں نے مکمل آزادی کی مانگ کی تھی۔اُن کے گرِدیدہ ہوگئے۔

1937 میں لال بہادر یوپی کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔ جہاں پہلی مرتبہ' اگرچہ بہت کم مدت کے لیے 'اُن کا واسطہ پنڈت گووند ولبھ پنت سے ہوا' جواہر لال کے بعد اُن پر سب سے زیادہ اثر پنڈت پنت کا ہی پڑا۔

جب گاندھی جی نے انفرادی ستیہ گرہ شروع کی جس میں شدید ضابطہ (ڈسپلن) اور صبر کی ضرورت تھی تو اُنھوں نے شاستری جی کو ایک ستیہ گرہی کی حیثیت سے چنا۔ پہلے ستیہ گرہی آچاریہ ونوبا بھاوے تھے۔

جیل کے دِنوں کے ایک واقعہ سے شاستری جی کے مضبوط اِرادے اور کردار کا پتہ چلتا ہے۔ایک مرتبہ جب وہ جیل میں تھے تو اُن کا بیٹا سخت بیمار ہوگیا۔ شاستری جی کو ایک ہفتے کے لیے عارضی رہائی پر چھوڑا گیا۔ جیل واپس جانے کے دِن بچّے کو تیز بخار تھا۔ یہ ایک گھنٹے اُس کے پاس کھڑے رہے۔ ضلع مجسٹریٹ نے کہلوایا کہ اُن کی عارضی رہائی کی مدّت بڑھائی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ یہ لکھ کر دیں کہ اِس مُدّت میں وہ کسی سیاسی کارروائی میں حصّہ نہیں لیں گے۔ شاستری جی نے اِس پیش کش کو منظور نہیں کیا اور بچے کو چلّاتا ہوا چھوڑ کر کہ ''بابوجی'' نہ جایئے'' وہ جیل واپس لوٹ گئے۔

لال بہادر شاستری تین مرتبہ جیل گئے۔ اور سب مِلا کر اُنھوں نے وہاں نو سال گزارے۔ اُنھوں نے یہ مدّت تعمیری کام میں گزاری اور بہت سی کتابیں پڑھیں۔ انھوں نے میڈم کیوری کی سوانح حیات کا بھی ہندی میں ترجمہ کیا۔

1946 میں ملک میں اہم واقعات رونما ہورہے تھے۔ جولائی میں مرکزی اور صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کے لیے عام انتخابات ہوئے۔ اگست میں مرکز میں جواہر لال نہرو کے تحت ایک عارضی حکومت بنائی گئی۔

صوبہ جات متحدہ آگرہ و اَودھ میں جسے اب اُتر پردیش کہا جاتا ہے کانگریس پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی اور گووِند وَلبھ عوام کی پسندیدہ حکومت کے سربراہ بنے۔ رہنمائی اور حکومت کی ذمے داریاں سنبھالنے کی تربیت دینے کے لیے وہ نوجوانوں کو آگے لانا چاہتے تھے۔ اُنھیں لال بہادر کی اِنکساری، کسی کو مخالفت کرنے کا موقع نہ دینے والا اور نرم مزاج پسند آیا۔ اُنھوں نے لال بہادر سے لکھنؤ آجانے کے لیے کہا اور اُنھیں اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنالیا۔

اب لال بہادر کی سیاسی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ آزادی کے سپاہی اور قانون ساز اسمبلی کے ممبر سے 'حکومت میں وزیر بن جانے کا۔ لال بہادر 'خاموش' اپنی شہرت سے بچنے والے اور سخت محنت کرنے والے کارکن تھے۔ وزیر اعلیٰ پنڈت پنت نے اُن کی خوبیوں کو دیکھا۔ جب ہندوستان آزاد ہو گیا اور رفیع احمد قدوائی 'یوپی' کی کابینہ سے نکل کر مرکزی کابینہ ممیں شامل ہوگئے۔ تو پنڈت پنت نے خالی جگہ پر لال بہادر شاستری کو پولیس اور ذرائع آمدورفت (ٹرانسپورٹ) کا وزیر بنادیا۔ اِس طرح لال بہادر کا پنڈت پنت سے تعلق شروع ہوا۔ جو پنت جی موت تک قائم رہا۔ شاستری جی کے پارلیمنٹ میں آنے کے لیے پنڈت پنت ہی بڑی حد تک ذمہ دار تھے۔

قومی منظر پر

1951 میں جب لال بہادر شاستری 48 سال کے تھے تو جواہر لال نہرو کے کہنے پر وہ قومی منظر پر آگئے۔ اور اُن کو کانگریس پارٹی کا جنرل سکریٹری بنادیا گیا۔ 1952 میں ملک میں عام انتخاب ہونے کی وجہ سے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے شاستری جی کا کام بہت اہم نوعیت کا تھا۔

چناؤ کے بعد لال بہادر شاستری ریلوے منسٹر ہوگئے۔ ریلوے منسٹر کی حیثیت سے اُنھوں نے بہت سے سدھار کیے۔ اُن کی پہلی توجہ عام آدمی کی طرف تھی۔ اُنھوں نے پہلے درجے اور تیسرے درجے کے مسافروں کو دی جانے والی سہولتوں میں زبردست فرق کو کم کیا۔ اُنھوں نے پہلے درجے کو ختم کردیا اور اُس وقت کے دوسرے درجے کو ہی پہلا درجہ قرار دیا۔ اُنھوں نے دو برتھ اور تین برتھ والے سونے کے ڈبوں کے لیے رزرویشن شروع کرایا۔ تیسرے درجے کے مسافروں کو ریسٹوراں کے ڈبوں سے کھانے کی تھالی

خرید نے کی سہولیت دی۔

1956 میں ریلوے منسٹر کے عہدے سے استعفے دے کر انھوں نے سارے ملک کو حیرانی میں ڈال دیا۔ جنوب میں "آریالر" کے مقام پر ریلوے حادثے کی ذمہ داری انھوں نے اپنے سر لی جس میں 144 لوگوں کی جانیں گئی تھیں۔ اِس استعفے سے انھوں نے ایک ایسی مثال قائم کردی جس کی نظیر بعد میں ملنا مشکل ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جواہر لال نہرو کو اُن کا استعفے منظور کرنا پڑا۔

اُس کے بعد لال بہادر بے کار نہیں بیٹھے۔ 1957 کے عام انتخاب پھر قریب تھے۔ جواہر لال نے اِن کو چناؤ کے انتظامات کرنے کی ذمے داری سونپ دی۔ شاستری جی اِس کام میں دِل و جان سے لگ گئے۔ اور اُن کی کوششوں کا پھل ملا۔ ریاستوں اور مرکز میں کانگریس پارٹی کو زبردست اکثریت حاصل ہوئی۔ وہ بھی اِلہ آباد سے چناؤ جیتے۔ اُنھیں 'ذرائع آمد ورفت (ٹرانسپورٹ) کا وزیر اور بعد میں 'تجارت اور صنعت' (کامرس اور انڈسٹری) کا وزیر بنایا گیا۔

وزیر داخلہ۔(ہوم منسٹر)

1961 میں پنڈت گووِند ولبھ پنت کے انتقال کے بعد لال بہادر شاستری وزیر داخلہ بنائے گئے۔ ایک ہوشیار اور طاقت ور قومی رہنما کی حیثیت سے ملک میں ان کا وقار بڑھا۔ اُس زمانے میں پنڈت نہرو سے اُن کے تعلقات اور گہرے ہوئے۔ اُن کی ایمانداری 'وفاداری' ضمیر کی آواز پر عمل کرنے اور محنت کرنے پر وزیر اعظم کو پورا بھروسہ تھا۔ بات چیت اور تال میل کے لیے 'شاستری جی پر اُن کا بھروسہ بڑھا۔ ہندوستان اور چین کی لڑائی کے دوران لوگوں کا حوصلہ بڑھائے رکھنے کی شاستری جی نے بہت کوشش کی۔ آسام میں زبان کا جھگڑا ہو یا کیرالا میں سیاسی اُلجھاؤ ہو۔ شاستری جی اپنی لیاقت کا بار بار ثبوت دیتے رہے۔ اُن کے تین زبانوں کے فارمولے نے بنگالی آسامی زبان پر فسادات کا خاتمہ کردیا۔

ایک مرتبہ پھر شاستری جی نے استعفے دے دیا۔ اس مرتبہ 1963 میں کامراج پلان کے تحت جس میں مرکز اور ریاستوں کے پرانے رہنماؤں سے پارٹی کا کام کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ لال بہادر شاستری نے سب سے پہلے استعفے دیا۔ لیکن جلد ہی وزیر اعظم نہرو نے اُن کو واپس بلالیا۔ بھونیشور میں کانگریس کے اجلاس میں پنڈت نہرو کو دِل کا سخت دورہ پڑا۔ جس

سے وہ پوری طرح سنبھل نہیں سکے۔ اُنھوں نے محسوس کیا۔ لال بہادر شاستری کی قابل قدر امداد کے بغیر وہ آسانی سے کام نہیں چلا سکتے۔ اُنھوں نے شاستری جی کو کوئی خاص ذمّے داری سونپے بغیر وزیر بنالیا۔ اُنھیں وزیر اعظم کے تمام فرائض میں اُن کی مدد کرنی تھی۔ کانگریس کے بڑے بڑے اور پرانے نیتاؤں میں سے پنڈت نہرو کا شاستری جی کو چن لینا' شاستری جی کے لیے ایک بڑا اعزاز تھا جو اِس بات کو بھی ظاہر کرتا تھا کہ شاستری جی اور کام کرنے کی اُن کی صلاحیت پر پنڈت نہرو کو کتنا بھروسہ تھا۔

لال بہادر شاستری کو سونپے گئے کاموں میں سے ایک اہم کام کشمیر کی مُشتعِل صورتِ حال کو ٹھنڈا کرنا تھا۔ یہ آگ حضرت بل کی مسجد سے ایک متبرک شے۔ حضرت محمدؐ کے ایک بال کے چوری چلے جانے کی وجہ سے بھڑک اُٹھی تھی۔ غیر مطمئن اور حکومت سے شکایت رکھنے والے لوگوں نے اِسے مذہبی معاملہ بنالیا تھا۔ لال بہادر شاستری صلح کرانے میں ماہر تھے۔ اُنھوں نے صورتِ حال کو احتیاط سے سنبھالا اور علاقے میں پھر اَمن واَمان قائم کردیا۔

27/ مئی 1964 کو قسمت نے ملک پر ایک سخت وار کیا۔ ایک چھتنار برگد گر پڑا۔ پنڈت نہرو کا انتقال ہوگیا۔

"نہرو کے بعد کون ؟" یہ سوال جو کچھ عرصے سے ملک کے اندر اور باہر لوگوں کو پریشان کیے تھا اب اور بھی اہم ہوگیا۔ لیکن پنڈت نہرو نے اِس معاملے پر جو سوچ رکھا تھا اُس کا ایک اِشارہ اُنھوں نے پہلے ہی کردیا تھا۔ مرنے سے ایک دِن پہلے اُنھوں نے شاستری جی سے کہا تھا کہ وہ جون میں ہونے والی کامن ویلتھ کانفرنس میں شرکت کی تیاری کریں۔

وزیر اعظم

اُس وقت کے کانگریس کے صدر کامراج کی کوششوں سے لال بہادر شاستری کو بہت آسانی سے کانگریس پارلیمانی پارٹی کا لیڈر چن لیا گیا۔ وہ ایک اونچی حیثیت رکھنے والے سادگی پسند اور بھروسے کے قابل رہنما تھے۔ جو کانگریس کے بائیں بازو اور دائیں بازو دونوں طرف کے لوگوں کے لیے قابل قبول تھے۔

وزیر اعظم کی حیثیت سے شاستری جی کو بہت سے مسائل وِرثے میں ملے۔ جیسے کہ غذا

کی کمی، غریبی، بے روزگاری اور سرحدوں پر چین اور پاکستان کی دھمکی بھری کارروائیاں۔ شاستری جی خود بھی ایک زمانے میں غریب رہ چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ غریب آدمی کی پہلی ضرورت پیٹ کا بھرنا ہے۔ اِس لیے اُنھوں نے پہلے غذا کے مسئلہ پر توجہ کی۔ ملک میں کافی غذا موجود نہ ہونے کی وجہ سے اُس کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگی تھیں۔ جہاں سے بھی ہو سکا اُنھوں نے غذا در آمد کی اور اُسے پورے ملک میں تقسیم کرایا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اِس مسئلے کے مستقل حل کے لیے ہمیں اپنی ضرورت کے مطابق غذا خود پیدا کرنی ہوگی۔ اِس کے لیے لمبے عرصے کے منصوبے بنانے ہوں گے۔ اُنھوں نے آب پاشی کے ذریعوں کو بہتر کرنے، کِسانوں کو اچھے قِسم کے بیج فراہم کرنے اور اپنی پیداوار کے لیے اُن کو اچھے دام ملنے کے انتظامات کیے تاکہ وہ پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کریں۔ اِن اقدامات کے اچھے نتائج نکلے اور ملک غذا میں خود کفیل (اپنی ضرورت آپ پوری کرنے) ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ سخت سوکھا پڑنے اور فصلوں کے مارے جانے کے باوجود ملک اپنے حالات کو خود سنبھال سکا۔

باہر کے معاملات کے بارے میں وزیر اعظم، بخوبی یہ جانتے تھے کہ پاکستان ہندوستان سے جھگڑا کرنے کے لیے تلا بیٹھا ہے۔ پاکستان کے صدر جنرل ایوب خاں سمجھتے تھے کہ ہندوستان 1962 کے چینی حملے کے صدمے سے ابھی پنپا نہیں ہے۔ اُس کے عظیم رہنما جواہر لال نہرو اب ملک کے سربراہ نہیں ہیں۔ نیا وزیر اعظم نہایت شریف، کمزور طبیعت اور نرم مزاج دکھائی دیتا ہے۔ جنرل ایوّب نے سوچا کہ ہندوستان کمزور حالت میں ہے اور اُس کے ساتھ لڑائی چھیڑنے کا یہ مناسب موقع ہے۔ اندازہ لگانے کے لیے اُنھوں نے 'کچھ' کے علاقے میں 'ران' انتخاب کیا۔ یہاں اُس کے حملے کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے ہندوستانی فوج تیار نہیں تھی۔ اُس سے ہمّت پاکر پاکستان نے کشمیر کی سرحد پر اپنی کارروائیاں شروع کیں اور مارچ اپریل 1965 میں 'چھمب' کے مقام پر بین الاقوامی سرحد پار کرلی۔

ہندپاک لڑائی

لال بہادر شاستری جو ایک سچّے گاندھی وادی تھے جانتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی اور اُس کو بچانے کے سلسلے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ جانتے تھے کہ داؤ پر کیا لگا ہوا ہے۔ اُنھوں نے مضبوط قدم اُٹھایا۔ اور جوابی حملہ کرنے سے ہچکچائے نہیں۔ پاکستان کے حملے کے جواب میں ہندوستانی فوجوں نے مغربی پنجاب میں بین الاقوامی سرحد پار کرلی۔ شاستری

جی نے لگام ڈھیلی کر دی۔ اور ہندوستانی فوجیں آگے بڑھیں۔ اُنھوں نے کشمیر میں آنے جانے کے تمام راستے بند کر دیے۔ ہندوستانی فوجوں نے پاکستان کے علاقے میں بہت دور اندر کے فوجی ٹھکانوں پر حملہ کر دیا۔ لڑائی کے بائیس دن بعد جنرل ایوّب نے ہندوستانی فوجوں کو لاہور اور سیالکوٹ کے بالکل پچھواڑے بیٹھا پایا۔ پاکستانی فوج تھک گئی اور اُس کی ہوائی فوج کو بھی سخت نقصان پہنچا۔ چین نے پاکستان کی مدد کرنی چاہی۔ اُس نے مشرقی محاذ پر ہندوستان کو دھمکی دی۔ ہندوستان کے وزیر اعظم پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُنھوں نے شاندار ہمّت کا مظاہرہ کیا۔ اِدھر چین نے بھی کچھ کیا نہیں۔

اب جنرل ایوّب لڑائی ختم کرانا چاہتے تھے۔ پاکستان اور چین میں سے کِسی کو ہندوستان سے اتنے سخت جواب کی امید نہیں تھی۔ لال بہادر شاستری کے مضبوط روّیے نے دونوں کی آنکھیں کھول دیں۔ انھوں نے شاستری جی کو جواہر لال نہرو کا ملائم بدل سمجھا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ انکساری اور شرافت کے پردے کے پیچھے ایک آہنی عزم بھی ہے۔

'اُنھیں سخت مایوسی ہوئی۔ ہندوپاک لڑائی کے دوران شاستری جی کے بیان بالکل صاف واضح اور مضبوط رہے۔

تاشقند میں

ریاستہائے متحدہ امریکہ (یو۔ایس۔اے) اور سوویت یونین دونوں کی طرف سے پیش کی ہوئی ایک تجویز اقوام متحدہ نے پاس کی جس میں پاکستان' ہندوستان دونوں سے جنگ بند کر دینے کے لیے کہا گیا تھا۔ ہندوستان کبھی جھگڑا نہیں چاہتا تھا وہ فوراً راضی ہو گیا' پاکستان جو کچھ بہتر سودا چاہتا تھا شروع میں ہچکچایا۔ پھر راضی ہو گیا لڑائی بند ہو گئی۔

بائیس دن کی لڑائی کے دوران اپنے اٹل رویے کے باوجود شاستری جی نے اپنے اِس یقین کو کبھی نہیں چھپایا کہ پاکستانی ہمارے ہی بھائی بند ہیں۔ اور ہمیں اُن کے ساتھ بات چیت کرنے اور فیصلہ کر لینے میں کبھی نہیں ہچکچانا چاہیے۔ اِس لیے جب سوویت وزیر اعظم الیکسی کوسِگن' نے پوچھا تو وہ جنرل ایوب خاں کے ساتھ بات چیت کی میز پر بیٹھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بہت غور وخوض اور بات چیت کے بعد 10 / جنوری 1966 کو سمجھوتے پر دستخط ہوئے۔

سمجھوتے کے مطابق دونوں ملکوں کی فوجیں 25 فروری 1966 تک لڑائی سے پہلے کے اپنے مقام پر واپس چلی جانی تھیں۔ اُنھوں نے یہ بھی مانا کہ علاقے کے لیے اَمن بہت ضروری ہے اور ہندوستان پاکستان میں تناؤ کا جاری رہنا دونوں مُلکوں کے عوام کے حق میں نہیں ہے۔

اور اِس کے ساتھ ہی ہندوستان کو ایک شدید صدمہ پہنچا۔ 10/ جنوری 1966 کی رات میں شاستری جی کو دِل کا بہت سخت دورہ پڑا اور 11/ جنوری 1966 کی صبح کو اُن کا انتقال ہو گیا۔ ہندوستان نے دونوں خبریں ایک ساتھ سُنیں۔ تاشقند معاہدہ پر دستخط اور ہندوستان کے اِس نئے ہیرو کے انتقال کی۔ خوشی سے زیادہ اُنھیں رنج ہوا۔ لال بہادر شاستری سے لوگوں کے محبت کرنے اور اُن کے مداح ہونے کا اندازہ اُس وقت ہوا جب لوگوں کی زبردست بھیڑ اُن کے جنازے میں شریک ہوئی۔ جمنا کے کنارے اُن کی آرام گاہ کو 'وِجے چوک' کا صحیح نام دیا گیا ہے۔

لال بہادر شاستری کے نمایاں رول کی ابتدا جواہر لال کے سایے میں ہوئی۔ ملک میں اور ملک کے باہر بھی لوگوں کو اِس "چھوٹے سے آدمی" (جیسا کہ امریکہ والے اُنھیں کہتے تھے) کی صلاحیت کے بارے میں شبہ تھا۔ لیکن ڈیڑھ سال کے مختصر عرصے میں لوگوں کو اپنی رائے کو بدلنا پڑا۔ لوگوں نے اُنھیں زبردست توانائی، کردار اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والی شخصیت اور امن کا ایک سچا حامی انسان پایا۔ وہ ملک کی تقدیر بنانے والے کی حیثیت سے اُبھرے۔ لوگ اُن کے نعرے "جے جوان جے کِسان" میں یقین رکھتے تھے۔ اُنھوں نے قوم میں پھر سے اعتماد قائم کیا۔

لال بہادر شاستری 'مرتے دم تک ایک ایسے سادہ انسان رہے جن کی زندگی کے انداز میں مشکل ہی سے کوئی تبدیلی آئی۔ چاہے وہ "لوگوں کے خادموں کی سوسائٹی" کے محض ایک ممبر رہے ہوں یا کابینہ کے ممبر یا سب سے بڑی جمہوریت کے وزیر اعظم۔ وہ غریبوں میں ایک غریب ہی رہے "میں حاکم نہیں ایک خادِم ہوں"۔